اسلام کی سپر تقیہ

فلسفۂ تقیہ

مقدمہ : ڈاکٹر محمد تیجانی سماوی

تصنیف : آیت اللہ ناصر مکارم شیرازی

ترجمہ و تلخیص : سید مختار حسین جعفری کشمیری

ضمیمہ : ایک محقق

اسلام کی سپر تقیہ

فلسفۂ تقیہ

مقدمہ : ڈاکٹر محمد تیجانی سماوی

تالیف : آیۃ اللہ ناصر مکارم شیرازی

ترجمہ و تلخیص : سید مختار حسین جعفری کشمیری

ضمیمہ : ایک محقق

ناشر :

رحمت اللہ بک ایجنسی

بالمقابل بڑا امام بارگاہ کھارادر کراچی نمبر ۷۴۰۰۰

فون : ۲۴۳۱۵۷۷

فہرست

نمبر شمار	عنوانات	صفحہ نمبر
۱	مقدمہ ڈاکٹر محمد تیجانی سماوی	۳
۲	تقیہ معرکۃ الآرا موضوع بحث	۱۳
۳	مقدمہ مترجم	۱۵
۴	حرف آغاز	۲۳
۵	تقیہ کے لغوی اور اصطلاحی معنی	۲۵
۶	تقیہ کا حکم تکلیفی	۲۸
۷	احادیث تقیہ	۳۵
	پہلا طائفہ	۳۵
	دوسرا طائفہ	۳۷
	تیسرا طائفہ	۳۸
	چوتھا طائفہ	۴۲
۸	چند ضروری امور	۴۷
	اول تقیہ میں اس قدر تاکید کی علت اور سبب کیا ہے؟	۴۷
	پہلی وجہ	۴۸
	دوسری وجہ	۴۹
	۱۔ تقیہ کی غرض و غایت اور اس کی قسمیں	۵۳

نمبر شمار	عنوانات	صفحہ نمبر
	۲۔ وجوب تقیہ کے موارد	۵۴
	ایک ضروری آگاہی	۵۵
۹	موارد حرمت تقیہ	۵۷
	۱۔ اگر دین میں فساد کا خطرہ ہو تو تقیہ جائز نہیں	۵۷
	۲۔ قتل میں تقیہ جائز نہیں	۶۱
	۳۔ شراب خوری یا اس طرح کے محرمات میں تقیہ حرام ہے۔	۶۲
	۴۔ ضرورت کے بغیر تقیہ جائز نہیں ہے۔	۶۶
	تذکر	۶۷
۱۰	اختیار کفر اور ایمان سے برائت میں تقیہ کا حکم	۶۸
	روایات تفصیل	۷۵
	دوسری بحث	۷۷
	احادیث کے مضامین میں ہم آہنگی کا طریقہ	۸۱
۱۱	تقیۃً پڑھی گئی نماز کا حکم	۸۴
۱۲	تقیہ سے متعلق ضروری مسائل (تنبیہات)	۹۳
	پہلا مسئلہ: کیا تقیہ مخالف مذہب کے ساتھ مخصوص ہے؟	۹۳
	دوسرا مسئلہ: تقیہ موضوعات میں	۹۶
	مسئلۂ اکراہ اور تقیہ	۱۰۰
	تیسرا مسئلہ: آیا تقیہ کی شروعیت کے لئے فرار کا راستہ نہ ہونا معتبر ہے یا نہیں؟	۱۰۴
	لیکن ہمارا نظریہ یہ ہے	۱۰۶
	چوتھا مسئلہ: محور تقیہ خوف شخصی ہے یا خوف نوعی	۱۱۰

نمبر شمار	عنوانات	صفحہ نمبر
	پہلی صورت	۱۱۰
	دوسری صورت	۱۱۱
	پہلی صورت کا حکم	۱۱۱
	دوسری صورت کا حکم	۱۱۲
	پانچواں مسئلہ: موارد وجوب میں تقیہ کی مخالفت	۱۱۴
	چھٹا مسئلہ: تقیہ کے بعد	۱۱۵
	ساتواں مسئلہ: آیا تقیہ واجب نفسی ہے یا واجب غیری؟	۱۱۸
	آٹھواں مسئلہ: تقیہ کی تیسری قسم	۱۱۹
۱۳	ضمیمہ بحث تقیہ	۱۲۳
۱۴	ایک صعب المرور منزل	۱۲۴
۱۵	امیرالمومنینؑ کی ایک بین فضیلت	۱۲۹
۱۶	امام غزالی کا فتویٰ	۱۳۰
۱۷	امام زہری کا قول	۱۳۰
۱۸	امام فخرالدین رازی کی رائے	۱۳۰
۱۹	ابن حجر کا مقولہ تقیہ کے بارے میں	۱۳۱
۲۰	صحابہ و تابعین نے تقیہ کیا	۱۳۲
۲۱	ابن عباس نے تقیہ کیا	۱۳۲
۲۲	ایک دوسرا قول	۱۳۳
۲۳	ابن عمر نے تقیہ کیا	۱۳۴
۲۴	ابن مسعود نے تقیہ کیا	۱۳۴

نمبر شمار	عنوانات	صفحہ نمبر
۲۵	راوی حدیث رسول نے تقیہ کیا	۱۴۵
۲۶	ابراہیم نخعی نے تقیہ کیا۔	۱۴۵
۲۷	زرارۃ ابن اوفی الحرشی نے تقیہ کیا	۱۴۵
۲۸	عبد اللہ ابن عمر کا تقیہ	۱۴۶
۲۹	قسطلانی نے شرح صحیح بخاری میں بیان کیا ہے	۱۴۷
۳۰	حسن بصری نے تقیہ کیا	۱۴۷
۳۱	محمد بن سیرین وشعبی نے تقیہ کیا	۱۴۸
۳۲	ایک بڑے گروہ نے تقیہ کیا	۱۴۸
۳۳	ابوذر کو تقیہ کا حکم	۱۴۹
۳۴	پھر ابوذر کے لئے تقیہ کی ہدایت	۱۵۱
۲۵	انبیاء نے تقیہ کیا	۱۵۲
۳۶	جناب خلیل اللہؑ کا دوسرا تقیہ	۱۵۳

مقدمہ

ڈاکٹر محمد تیجانی سماوی
ترجمہ: مستجاب احمد انصاری

اہل سنّت کے نزدیک "بداء" بہت ہی قابلِ اعتراض اور مکروہ عقیدہ ہے۔ اسی طرح تقیّہ کو بھی وہ برا سمجھتے ہیں اور اس پر شیعہ بھائیوں کا مذاق اڑاتے ہیں بلکہ شیعوں کو منافق سمجھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ شیعوں کے دل میں کچھ اور ہوتا ہے اور ظاہر کچھ اور کرتے ہیں۔

میں نے اکثر اہل سنّت سے گفتگو کر کے انھیں یقین دلانے کی کوشش کی کہ تقیّہ نفاق نہیں ہے لیکن انھیں تو کسی بات کا یقین ہی نہیں آتا سوائے اس کے کہ جو انھیں ان کی مذہبی عصبیت نے سکھا دیا ہے یا جو ان کے بڑوں بزرگوں نے ان کے دل میں بٹھا دیا ہے۔

یہ بڑے پوری کوشش کرتے ہیں کہ ان انصاف پسند اور تحقیق کے طالب لوگوں سے جو شیعوں اور شیعہ عقائد کے متعلق معلومات حاصل کرنا چاہتے ہیں، حقائق کو چھپائیں اور یہ کہہ کر انھیں شیعوں سے متنفر کرنے کی کوشش کریں کہ یہ عبداللہ بن سبا یہودی کا فرقہ ہے جو رجعت، بداء، تقیّہ، عصمت اور متعہ کا قائل ہے اور اس کے عقائد میں بہت سے خرافات اور فرضی باتیں شامل ہیں جیسے مثلاً مہدیٔ منتظر وغیرہ کا عقیدہ۔ جو شخص ان کی باتوں کو سنتا ہے وہ کبھی اظہارِ نفرت کرتا ہے اور کبھی اظہارِ حیرت۔ اور یہی سمجھتا ہے کہ ان خیالات کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں، یہ سب شیعوں کی منگھڑت اور فرضی باتیں ہیں۔

مگر جب کوئی شخص تحقیق کرتا ہے اور انصاف سے کام لیتا ہے تب اسے معلوم ہوتا ہے کہ ان سب عقائد کا اسلام سے گہرا تعلق ہے اور یہ قرآن و سنّت کی کوکھ سے پیدا ہوئے ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ اسلامی عقائد و تصورات ان کے بغیر اپنی صحیح شکل اختیار ہی نہیں کر سکتے۔

اہلِ سنّت میں عجیب بات یہ ہے کہ جن عقائد کو وہ برا سمجھتے ہیں، ان ہی

عقائد سے ان کی کتابیں اور احادیث کے معتبر مجموعے بھرے ہوئے ہیں۔ اب ایسے لوگوں کا کیا علاج جو کہتے کچھ ہیں اور کرتے کچھ اور ہیں۔ اور جو خود اپنے عقائد کی اس لیے ہنسی اڑاتے ہیں کیونکہ شیعہ ان پر عامل ہیں۔

ہم بداء کی بحث میں ثابت کر چکے ہیں کہ اہلِ سنّت خود بداء کے قائل ہیں لیکن اگر دوسرے بداء کے قائل ہوں تو ان پر اعتراض کرنے سے نہیں چوکتے۔

اب آیئے دیکھیں تقیّہ کے مسئلہ میں اہلِ سنّت والجماعت کیا کہتے ہیں؟ اس کی بنا پر تو وہ شیعوں پر منافق ہونے تک کا الزام لگاتے ہیں۔

ابن جریر طبری اور ابن ابی حاتم نے عوفی کے واسطے سے ابن عباس سے روایت بیان کی ہے کہ اس آیت "اِلَّآ اَنْ تَتَّقُوْا مِنْھُمْ تُقٰىةً" کے بارے میں ابنِ عباس کہتے تھے کہ:

"تقیّہ زبان سے ہوتا ہے۔ اس کی صورت یہ ہے کہ کوئی کسی شخص کو ایسی بات کہنے پر مجبور کرے جو اصل میں معصیت ہے تو وہ اگر لوگوں کے ڈر کے مارے وہ بات کہہ دے جب کہ اس کا دل پوری طرح ایمان پر قائم ہو تو اسے کچھ نقصان نہیں ہوگا یہ بھی یاد رکھو کہ تقیّہ محض زبان سے ہوتا ہے۔"[1]

یہ روایت حاکم نے نقل کی ہے اور اسے صحیح کہا ہے۔ بیہقی نے بھی اپنی سنن میں عطاء عن ابن عباس کے حوالے سے اِلَّآ اَنْ تَتَّقُوْا مِنْھُمْ تُقٰىةً (مگر ہاں ایسی صورت میں کہ تم کو ان سے کچھ اندیشۂ ضرر ہو۔ (سورۂ آل عمران۔ آیت ۲۸) کا مطلب بیان کرتے ہوئے کہا ہے کہ ابنِ عباس کہتے تھے کہ "تُقٰىةً" کا تعلق زبان سے کہنے سے ہے بشرطیکہ دل ایمان پر قائم ہو۔"[2]

عبد بن حمید نے حسن بصری سے روایت بیان کی ہے کہ حسن بصری کہتے تھے کہ تقیّہ روزِ قیامت تک جائز ہے۔"[3]

عبد بن ابی رجاء نے نقل کیا ہے کہ حسن بصری اس آیت کو اس طرح پڑھتے تھے: اِلَّآ اَنْ تَتَّقُوْا مِنْھُمْ تَقِيَّةً۔[4]

---

۱ سیوطی، تفسیر درمنثور ۲ سنن بیہقی۔ مستدرک حاکم ۳ سیوطی، درمنثور

عبدالرزاق، ابن سعد، ابن جریر طبری، ابن ابی حاتم اور ابن مردویہ نے مندرجہ ذیل روایت بیان کی ہے، حاکم نے مستدرک میں اسے صحیح کہا ہے، بیہقی نے دلائل میں اس کو نقل کیا ہے۔ روایت یہ ہے:

مشرکین نے عمار بن یاسرؓ کو پکڑ لیا اور اس وقت تک نہ چھوڑا جب تک عمارؓ نے نبی اکرمؐ کو گالی نہ دی اور مشرکین کے معبودوں کی تعریف نہ کی۔ ابن سعد، طبقات الکبریٰ۔

آخر جب عمارؓ کو مشرکین نے چھوڑ دیا تو وہ رسول اللہؐ کے پاس آئے۔ رسول اللہؐ نے پوچھا، کہو کیا گزری؟ عمارؓ نے کہا: بہت بری گزری، انھوں نے مجھے اس وقت تک نہ چھوڑا جب تک میں نے آپ کی شان میں گستاخی نہ کی اور ان کے معبودوں کی تعریف نہ کی۔ رسول اکرمؐ نے پوچھا: تمھارا دل کیا کہتا ہے؟ عمارؓ نے کہا: میرا دل تو ایمان پر پختہ اور قائم ہے۔ رسول اللہؐ نے فرمایا: اگر وہ لوگ تم پر پھر زبردستی کریں تو پھر ایسے ہی کہہ دینا۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی:

مَنْ كَفَرَ بِاللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ اِيْمَانِهٖٓ اِلَّا مَنْ اُكْرِهَ وَ قَلْبُهٗ مُطْمَئِنٌّۢ بِالْاِيْمَانِ۔

یعنی جو شخص ایمان لانے کے بعد خدا کے ساتھ کفر کرے مگر وہ نہیں جو کفر پر زبردستی مجبور کردیا جائے اور اس کا دل ایمان کے ساتھ مطمئن ہو۔ (سورۂ نحل۔ آیت ۱۰۶)

ابن سعد نے محمد بن سیرین سے روایت بیان کی ہے کہ رسول اللہؐ نے دیکھا کہ عمارؓ رو رہے ہیں۔ آپ نے ان کے آنسو پونچھے اور کہا: (مجھے معلوم ہے کہ) کفار نے تمھیں پانی میں ڈبو دیا تھا تب تم نے ایسا کہا۔ اگر وہ پھر تمھارے ساتھ ایسا ہی سلوک کریں، تو پھر یہی کہہ دینا۔ ابن سعد، طبقات الکبریٰ

ابن جریر، ابن منذر، ابن ابی حاتم نے اور بیہقی نے اپنی سنن میں عن علی عن ابن عباس کے حوالے سے بیان کیا ہے کہ

ابن عباس اس آیت کی تفسیر میں کہتے تھے: مَنْ كَفَرَ بِاللّٰهِ کہ اللہ نے خبر دی ہے کہ جس نے ایمان کے بعد کفر کیا، اس پر اللہ کا غضب نازل ہوگا اور اس کے لیے سخت عذاب ہے مگر جسے مجبور کیا گیا اور اس نے دشمن سے بچنے کے لیے زبان سے کچھ کہہ دیا مگر اس کے دل میں ایمان ہے اور اس کا دل اس کی زبان کے ساتھ نہیں، تو کوئی بات نہیں کیونکہ اللہ اپنے بندوں سے صرف اس بات کا مواخذہ کرتا ہے جس پر ان کا دل جم جائے۔

ابن ابی شیبہ، ابن جریر طبری، ابن منذر اور ابن ابی حاتم نے مجاہد سے روایت بیان کی ہے کہ یہ آیت مکے کے کچھ لوگوں کے بارے میں نازل ہوئی تھی۔ ہوا یوں کہ یہ لوگ ایمان لے آئے تو انھیں بعض صحابہ نے مدینے سے لکھا کہ ہجرت کرکے یہاں آجاؤ۔ جب تک تم ہجرت کرکے یہاں نہیں آؤ گے، ہم تمھیں اپنا ساتھی نہیں سمجھیں گے۔ اس پر وہ مدینہ کے ارادے سے نکلے۔ راستے میں انھیں قریش نے پکڑ لیا اور ان پر سختی کی۔ مجبوراً انھیں کچھ کلمات کفر کہنے پڑے۔ ان کے بارے میں یہ آیت نازل ہوئی: اِلَّا مَنْ اُكْرِهَ وَقَلْبُهٗ مُطْمَئِنٌّۢ بِالْاِيْمَانِ۔

بخاری نے اپنی صحیح میں باب المداراۃ مع الناس میں ایک روایت نقل کی ہے، جس کے مطابق ابوالدرداء کہتے تھے،

کچھ لوگ ہیں جن سے ہم بڑی خندہ پیشانی سے ملتے ہیں، لیکن ہمارے دل ان پر لعنت بھیجتے ہیں۔ صحیح بخاری جلد ۸ صفحہ ۱۰۲

حلبی نے اپنی سیرت میں یہ روایت بیان کی ہے، وہ کہتے ہیں کہ جب رسول اللہؐ نے شہر خیبر فتح کیا تو حجاج بن علاط نے آپ سے عرض کیا: یا رسول اللہ! مکے میں میرا کچھ سامان ہے اور وہاں میرے گھر والے بھی ہیں، میں انھیں لانا چاہتا ہوں، کیا مجھے اجازت ہے اگر میں کوئی ایسی بات کہہ دوں جو آپ کی شان میں گستاخی ہو؟ رسول اللہؐ نے اجازت دے دی اور کہا: جو چاہے کہو۔

علی بن برہان الدین شافعی، انسان العیون المعروف بہ سیرت حلبیہ جلد ۳ صفحہ ۶۱

امام غزالی کی کتاب احیاء العلوم میں ہے کہ:
"مسلمان کی جان بچانا واجب ہے۔ اگر کوئی ظالم کسی مسلمان کو قتل کرنا چاہتا ہو اور وہ شخص چھپ جائے تو ایسے موقع پر جھوٹ بول دینا واجب ہے"۔[1]
جلال الدین سیوطی نے اپنی کتاب الاشباہ والنظائر میں ایک روایت بیان کی ہے۔ اس میں لکھا ہے:
"فاقہ کشی کی حالت میں مردار کھانا، شراب میں لقمہ ڈبونا اور کفر کا کلمہ زبان سے نکالنا جائز ہے۔ اگر کسی جگہ حرام ہی حرام ہو اور حلال شاذ و نادر ہی ملتا ہو تو حسبِ ضرورت حرام کا استعمال جائز ہے۔"
ابوبکر رازی نے اپنی کتاب احکام القرآن میں اس آیت اِلَّآ اَنْ تَتَّقُوْا مِنْھُمْ تُقٰۃً کی تفسیر بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ
مطلب یہ ہے کہ اگر تمھیں جان جانے یا کسی عضو کے تلف ہو جانے کا اندیشہ ہو تو تم کفّار سے بہ ظاہر دوستی کا اظہار کر کے اپنی جان بچا سکتے ہو۔ آیت کے الفاظ سے یہی معنی نکلتے ہیں اور اکثر اہلِ علم اسی کے قائل ہیں۔ قتادہ نے بھی لَا یَتَّخِذِ الْمُؤْمِنُوْنَ الْکٰفِرِیْنَ اَوْلِیَآءَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِیْنَ کی تفسیر کرتے ہوئے یہی کہا ہے کہ مومن کے لیے جائز نہیں کہ کسی کافر کو دین کے معاملے میں اپنا دوست یا سرپرست بنائے سوائے اس کے کہ ضرر کا اندیشہ ہو۔ قتادہ نے مزید کہا ہے کہ اِلَّآ اَنْ تَتَّقُوْا مِنْھُمْ تُقٰۃً سے ظاہر ہوتا ہے کہ تقیّہ کی صورت میں زبانی کفر کا اظہار جائز ہے۔[2]
صحیح بخاری میں عروہ بن زبیر سے روایت ہے کہ حضرت عائشہ نے انھیں بتلایا کہ

[1] حجۃ الاسلام ابو حامد غزالی: احیاء علوم الدین۔
[2] ابوبکر رازی: احکام القرآن جلد ۲ صفحہ ۱۰

ایک دفعہ ایک شخص نے رسول اللہؐ کی خدمت میں حاضر ہونے کی اجازت چاہی تو آپ نے فرمایا: لغو آدمی ہے، خیر آنے دو۔ جب وہ شخص آیا تو آپ نے بڑی نرمی سے اس سے بات چیت کی۔ میں نے پوچھا: یا رسول اللہؐ! ابھی تو آپ نے کیا فرمایا تھا پھر آپ نے اس سے گفتگو اتنی خوش اخلاقی سے کی؟ آپ نے جواب دیا: عائشہ! اللہ کے نزدیک وہ بدترین آدمی ہے جس سے لوگ اس کی بدزبانی کی وجہ سے بچیں یا اس کی بدزبانی کی وجہ سے اسے چھوڑ دیں۔

صحیح بخاری جلد ۵ باب لَمْ یَکُنِ النَّبِیُّ فَاحِشًا وَّلَا مُتَفَحِّشًا۔

اس قدر تبصرہ یہ دکھانے کے لیے کافی ہے کہ اہلِ سنّت تقیّہ کے جواز کے پوری طرح قائل ہیں ۔ وہ یہ بھی مانتے ہیں کہ تقیّہ قیامت تک جائز رہے گا اور ۔ جیسا کہ غزالی نے کہا ہے، ان کے نزدیک بعض صورتوں میں جھوٹ بولنا واجب ہے اور بقول رازی جمہور علماء کا یہی مذہب ہے ۔ بعض صورتوں میں اظہارِ کفر بھی جائز ہے اور ۔ جیسا کہ بخاری اعتراف کرتے ہیں بہ ظاہر مسکرانا اور دل میں لعنت کرنا بھی جائز ہے اور ۔ جیسا کہ صاحب سیرۃ حلبیہ نے لکھا ہے، اپنے مال کے ضائع ہو جانے کے خوف سے رسول اللہؐ کی شان میں گستاخی کرنا بلکہ کچھ بھی کہہ دینا روا ہے۔ اور ۔ جیسا کہ سیوطی نے اعتراف کیا ہے لوگوں کے خوف سے ایسی باتیں کہنا بھی جائز ہے جو گناہ ہیں۔

اب اہلِ سنّت کے لیے اس کا قطعاً جواز نہیں کہ وہ شیعوں پر ایک ایسے عقیدے کی وجہ سے اعتراض کریں جس کے وہ خود بھی قائل ہیں اور جس کی روایات ان کی مستند حدیث کی کتابوں میں موجود ہیں جو تقیّہ کو نہ صرف جائز بلکہ واجب بتلاتی ہیں جن باتوں کے اہلِ سنّت قائل ہیں، شیعہ ان سے زیادہ کچھ نہیں کہتے۔ یہ بات البتہ ہے کہ وہ تقیّہ پر عمل کرنے میں دوسروں سے زیادہ مشہور ہو گئے ہیں۔ اور وجہ اس کی وہ ظلم و تشدد ہے جس سے شیعوں کو اموی اور عباسی دور میں سابقہ پڑا۔ اس دور میں کسی شخص کے قتل کر دیے جانے کے لیے کسی کا اتنا کہہ دینا کافی تھا کہ "یہ بھی

شیعانِ اہلِ بیت میں سے ہے۔"

ایسی صورت میں شیعوں کے لیے اس کے سوا کوئی چارہ کار ہی نہیں تھا کہ وہ ائمہ اہلِ بیت علیہم السلام کی تعلیمات کی روشنی میں تقیہ پر عمل کریں۔

امام جعفر صادق علیہ السلام سے مروی ہے کہ آپ نے فرمایا:

اَلتَّقِیَّۃُ دِیْنِیْ وَ دِیْنُ اٰبَائِیْ.

تقیہ میرا اور میرے آباء و اجداد کا دین ہے۔

اور یہ بھی فرمایا کہ

مَنْ لَا تَقِیَّۃَ لَہٗ لَا دِیْنَ لَہٗ.

جو تقیہ نہیں کرتا، اس کا دین ہی نہیں۔

تقیہ خود ائمہ اہلِ بیت کا شعار تھا، اور اس کا مقصد اپنے آپ کو اور اپنے پیروکاروں اور دوستوں کو ضرر سے محفوظ رکھنا، ان کی جانیں بچانا اور ان مسلمانوں کی بہتری کا سامان کرنا تھا جو اپنے معتقدات کی وجہ سے تشدد کا شکار ہوتے تھے، جیسے مثلاً عمار بن یاسرؓ۔ بعض کو تو عمار بن یاسرؓ سے بھی زیادہ تکلیف اٹھانی پڑی۔

اہلِ سنّت ان مصائب سے محفوظ تھے کیونکہ ان کا ظالم حکمرانوں کے ساتھ مکمل اتحاد تھا۔ اس لیے انھیں نہ قتل کا سامنا کرنا پڑا، نہ لوٹ کھسوٹ کا، نہ ظلم و ستم کا۔ اس لیے یہ قدرتی امر ہے کہ وہ نہ صرف تقیہ کا انکار کرتے ہیں بلکہ تقیہ کرنے والوں پر طعن و تشنیع بھی کرتے ہیں۔ دراصل بنی اُمیّہ اور بنی عباس کے حکمرانوں نے تقیہ کی بنا پر شیعوں کو بدنام کرنے میں بڑا کردار ادا کیا ہے۔ ان ہی کی پیروی اہلِ سُنّت والجماعت نے کی ہے۔

جب اللہ سُبحانہٗ نے قرآن میں تقیہ کا حکم نازل فرمایا ہے اور جب خود رسول اللہؐ نے اس پر عمل کیا ہے، جیسا کہ بخاری کی روایت میں آپ پڑھ چکے ہیں اس کے علاوہ رسول اللہؐ نے عمار بن یاسرؓ کو اجازت دی کہ اگر کفار پھر ان پر تشدد کریں اور اذیت دیں تو جو کلماتِ کفر کفار کہلوانا چاہیں وہ کہہ دیں۔ نیز یہ کہ قرآن و سُنّت پر عمل کرتے ہوئے علماء نے بھی تقیہ کی اجازت دی ہے تو پھر آپ ہی انصاف سے بتائیں کہ کیا اس کے بعد بھی شیعوں پر طعن کرنا اور ان پر اعتراض کرنا درست ہے؟

صحابۂ کرام نے ظالم حکمرانوں کے عہد میں تقیہ پر عمل کیا ہے۔ اس وقت جبکہ ہر شخص کو جو علی بن ابی طالبؑ پر لعنت کرنے سے انکار کرتا تھا قتل کر دیا جاتا تھا حجر بن عدی کندی اور ان کے ساتھیوں کا قصہ تو مشہور ہے۔ اگر میں صحابہ کے تقیہ کی مثالیں جمع کروں تو ایک الگ کتاب کی ضرورت ہوگی۔ لیکن میں نے اہلِ سُنّت کے حوالوں سے جو دلائل پیش کیے ہیں وہ بحمداللہ کافی ہیں۔

لیکن اس موقع پر ایک دلچسپ واقعہ ضرور بیان کروں گا جو خود میرے ساتھ پیش آیا۔ ایک دفعہ ہوائی جہاز میں میری ملاقات اہلِ سُنّت کے ایک عالم سے ہوگئی ہم دونوں برطانیہ میں منعقد ہونے والی ایک اسلامی کانفرنس میں مدعو تھے۔ دو گھنٹے تک ہم شیعہ سُنّی مسئلے پر گفتگو کرتے رہے۔ یہ صاحب اسلامی اتحاد کے داعی اور حامی تھے۔ مجھے بھی ان میں دلچسپی پیدا ہوگئی تھی لیکن اس وقت مجھے بُرا معلوم ہوا جب انھوں نے یہ کہا کہ شیعوں کو چاہیے کہ وہ اپنے بعض ایسے عقائد چھوڑ دیں جو مسلمانوں میں پھوٹ ڈالتے اور ایک دُوسرے پر طعن و تشنیع کا سبب بنتے ہیں۔ میں نے پُوچھا: مثلاً؟

انھوں نے بے دھڑک جواب دیا: مثلاً مُتعہ اور تقیہ۔

میں نے انھیں سمجھانے کی بہت کوشش کی کہ متعہ تو جائز ہے اور قانونی نکاح کی ایک صورت ہے اور تقیہ اللہ کی طرف سے ایک رعایت اور اجازت ہے لیکن وہ حضرت اپنی بات پر اڑے رہے اور میری ایک نہ مانے، نہ ہی میرے دلائل انھیں قائل کرسکے۔

کہنے لگے: جو کچھ آپ نے کہا ہے، ممکن ہے کہ وہ صحیح ہو، لیکن مصلحت یہی ہے کہ مسلمانوں کی وحدت کی خاطر ان چیزوں کو ترک کر دیا جائے۔

مجھے ان کی منطق عجیب معلوم ہوئی، کیونکہ وہ مسلمانوں کی وحدت کی خاطر اللہ کے احکام کو ترک کرنے کا مشورہ دے رہے تھے۔ پھر بھی میں نے ان کا دل رکھنے کو کہا: اگر مسلمانوں کا اتحاد اسی پر موقوف ہوتا تو میں پہلا شخص ہوتا جو یہ بات مان جاتا۔

ہم لندن ایرپورٹ پر اُترے تو میں ان کے پیچھے چل رہا تھا۔ جب ہم ایرپورٹ پولیس کے پاس پہنچے تو ہم سے برطانیہ آنے کی وجہ پوچھی گئی۔

ان صاحب نے کہا، میں علاج کے لیے آیا ہوں۔

میں نے کہا کہ میں اپنے کچھ دوستوں سے ملنے آیا ہوں۔

اس طرح ہم دونوں کسی دقت کے بغیر وہاں سے گزر کر اس ہال میں پہنچ گئے جہاں سامان وصول کرنا تھا۔ اس وقت میں نے چپکے سے ان کے کان میں کہا کہ، آپ نے دیکھا کیسے تقیہ (نظریۂ ضرورت) ہر زمانے میں کار آمد ہے؟

کہنے لگے: کیسے؟

میں نے کہا: ہم دونوں نے پولیس سے جھوٹ بولا۔ میں نے کہا میں دوستوں سے ملاقات کے لیے آیا ہوں، اور آپ نے کہا کہ میں علاج کے لیے آیا ہوں۔ حالانکہ ہم دونوں کانفرنس میں شرکت کے لیے آئے ہیں۔

وہ صاحب کچھ دیر مسکراتے رہے۔ سمجھ گئے تھے کہ میں نے ان کا جھوٹ سن لیا۔ پھر کہنے لگے، کیا اسلامی کانفرنسوں میں ہمارا رُوحانی علاج نہیں ہوتا؟

میں نے ہنس کر کہا، تو کیا ان کانفرنسوں میں ہماری اپنے دوستوں سے ملاقات نہیں ہوتی؟

اب میں پھر اپنے موضوع پر واپس آتا ہوں۔ میں کہتا ہوں کہ اہلِ سنّت کا یہ کہنا غلط ہے کہ تقیہ نفاق کی کوئی شکل ہے بلکہ بات اس کی اُلٹ ہے کیونکہ نفاق کے معنی ہیں: ظاہر میں ایمان اور باطن میں کفر — اور تقیہ کے معنی ہیں ظاہر میں کفر اور باطن میں ایمان۔ ان دونوں باتوں میں زمین آسمان کا فرق ہے۔

نفاق کے متعلق اللہ سبحانہٗ نے فرمایا ہے:

وَإِذَا لَقُوا الَّذِينَ آمَنُوا قَالُوا آمَنَّا وَإِذَا خَلَوْا إِلَىٰ شَيَاطِينِهِمْ قَالُوا إِنَّا مَعَكُمْ إِنَّمَا نَحْنُ مُسْتَهْزِئُونَ.

جب وہ مؤمنوں سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم بھی مومن ہیں اور جب اپنے شیطانوں کے ساتھ تنہائی میں ہوتے ہیں تو

کہتے ہیں کہ ہم تمھارے ساتھ ہیں، ہم تو مذاق کر رہے تھے۔

[سورۂ بقرہ - آیت ۱۴]

اس کا مطلب ہوا: ایمان ظاہر + کفر باطن = نفاق

تقیہ کے بارے میں اللہ سبحانہٗ نے کہا ہے:

وَقَالَ رَجُلٌ مُّؤْمِنٌ مِّنْ آلِ فِرْعَوْنَ يَكْتُمُ إِيمَانَهُ

"فرعون کی قوم میں سے ایک مومن شخص نے جو اپنا ایمان چھپائے ہوئے تھا کہا....."

اس کا مطلب ہوا: کفر ظاہر + ایمان باطن = تقیہ

یہ مومن آلِ فرعون اپنا ایمان چھپائے ہوئے تھا جس کا علم سوائے اللہ کے کسی کو نہیں تھا، وہ فرعون اور دوسرے سب لوگوں کے سامنے یہی ظاہر کرتا تھا کہ وہ فرعون کے دین پر ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس کا ذکر قرآن کریم میں تعریف کے انداز میں کیا ہے۔

اب قارئین با تمکین آیئے دیکھیں! خود شیعہ تقیہ کے بارے میں کیا کہتے ہیں تاکہ ان کے بارے میں جو غلط سلط باتیں مشہور ہیں، جو جھوٹ بولا جاتا اور طوفان اُٹھایا جاتا ہے، ہم اس سے دھوکا نہ کھانے پائیں۔

شیخ محمد رضا مظفر اپنی کتاب عقائد الامامیہ میں لکھتے ہیں:

تقیہ بعض موقعوں پر واجب ہے اور بعض موقعوں پر واجب نہیں۔ اس کا دارومدار اس پر ہے کہ ضرر کا کتنا خوف ہے۔ تقیہ کے احکام فقہی کتابوں کے مختلف ابواب میں علماء نے لکھے ہیں۔ ہر حالت میں تقیہ واجب نہیں۔ صرف بعض صورتوں میں تقیہ کرنا جائز ہے۔

بعض صورتوں میں تو تقیہ نہ کرنا واجب ہے، مثلاً اس صورت میں جب کہ حق کا اظہار، دین کی مدد، اسلام کی خدمت اور جہاد ہو۔ ایسے موقع پر جان و مال کی قربانی سے دریغ نہیں کیا جاتا۔

بعض صورتوں میں تقیہ حرام ہے یعنی ان صورتوں میں جب

تقیہ کا نتیجہ خونِ ناحق، باطل کا رواج یا دین میں بگاڑ ہو یا تقیہ کے باعث مسلمانوں کا سخت نقصان ہوتے، مسلمانوں میں گمراہی پھیلنے یا ظلم و جور کے فروغ پانے کا اندیشہ ہو۔

بہرحال شیعوں کے نزدیک تقیہ کا جو مطلب ہے وہ یہ نہیں کہ اس کی بنا پر شیعوں کو تخریبی مقاصد کی کوئی خفیہ پارٹی سمجھ لیا جائے، جیسا کہ شیعوں کے بعض وہ غیر محتاط دشمن چاہتے ہیں جو صحیح بات کو سمجھنے کی تکلیف گوارا نہیں کرتے۔ (ہم غیر محتاط شیعوں سے بھی کہیں گے کہ)

اقوالِ غیر جو پئے اسلام ہیں مضر
اپنی زباں سے ان کی حکایت نہ کیجیے

اسی طرح تقیہ کے یہ بھی معنی نہیں کہ اس کی وجہ سے دین اور اس کے احکام ایسا راز بن جائیں جسے شیعہ مذہب کو نہ ماننے والوں کے سامنے ظاہر نہ کیا جا سکے۔ اور یہ ہو بھی کیسے سکتا ہے جبکہ شیعہ علماء کی تصانیف خصوصاً ان کی فقہ، احکام عقائد اور علم کلام سے متعلق کتابیں مشرق و مغرب میں ہر جگہ اتنی تعداد میں پھیلی ہوئی ہیں کہ اس سے زیادہ تعداد کی کسی مذہب کے ماننے والوں سے توقع نہیں کی جا سکتی۔

اب آپ خود دیکھ لیجیے کہ دشمنوں کے خیال کے برخلاف یہاں نہ نفاق ہے نہ مکر و فریب، نہ دھوکا ہے نہ جھوٹ!

وما توفیقی الا باللہ علیہ توکلت والیہ انیب

محمد تیجانی سماوی تیونسی

بسم اللہ الرحمن الرحیم

تقیہ

معرکۃ الآراء موضوع بحث

شیعوں اور اہلسنت حضرات کے درمیان تقیہ سے زیادہ کوئی مسئلہ سوءِ تفاہم کا باعث نہیں اور اہل سنت حضرات کی نظروں میں تقیہ سے زیادہ کوئی دوسرا مسئلہ پردۂ خفا میں نہیں۔

ہمارے سنی بھائی ہمیشہ ہم سے یہی کہتے ہیں کہ آپ جس قدر چاہیں اپنے عقیدے کی وضاحت کریں اور چاہے جتنا کہیں کہ ہم قرآن میں کسی تحریف کے قائل نہیں اور ہمارے تمام گھروں اور شہروں میں قرآن موجود ہے اور وہی قرآن ہے جو دوسرے مسلمانوں کے پاس ہے۔ لیکن ہم آپ کی اس بات پر یقین نہیں کرتے۔ اس لئے کہ ممکن ہے آپ اس میں تقیہ سے کام لے رہے ہوں۔

چونکہ تقیہ آپ کے نزدیک اسلام کے بنیادی اصولوں میں سے ہے۔

اسی طرح جب دوسرے اسلامی مسائل کے سلسلہ میں ہم ان سے (اہل سنت حضرات) سے گفتگو کرتے ہیں اور اپنے عقائد کو جن کی بنیاد قرآن و سنت اور کلماتِ اہلبیت علیہم السلام پر استوار ہے بیان کرتے ہیں تو ان کا جواب وہی ہوتا ہے (کہ ممکن ہے آپ تقیہ کر رہے ہوں)

یہ صورت حال اس امر کی غمازی کرتی ہے کہ اہل سنت حضرات کا جو تقیہ کے معنی اور

مفہوم سے آگاہ نہیں۔ اور یہ کہ تقیہ کا ان کے نزدیک کوئی اور مفہوم ہے۔ نیز یہ لوگ
کہ تقیہ کی بنیاد قرآن و سنت ہے۔ کلام خدا میں صریح آیتیں اس پر دلالت کرتی ہیں اور
پیغمبر کرام میں بھی تقیہ مشہور ہے اور آنحضرت کے برجستہ صحابیوں نے اس قانون پر عمل کیا
اس کا مطلب یہ ہے کہ تقیہ کا انکار قرآن و سنت کا انکار ہے۔ تقیہ کا وجود نہ صرف قرآن و سنت
میں ہے بلکہ دنیا بھر کے عقلمندوں کے نزدیک تقیہ ایک جانی پہچانی عقلی عمل (روش) ہے
انسانیت کے ہر مرحلے میں اس کا وجود شاہد ہے۔

اس کتاب کا مقصد انہی مسائل کو واضح کرنا ہے۔ مقصد یہ ہے کہ یہ اسلامی قانون
تقیہ اپنے صحیح لباس میں دنیا کے سامنے روشن ہو جائے تاکہ صحیح اور تحریف شدہ تقیہ کے درمیان
میں تمیز کی جا سکے۔ اور اہل سنت حضرات جو شیعوں کے بارے میں بدگمانی کا شکار ہیں اس کا
ازالہ ہو سکے۔

ہماری طرف سے اس کتاب کی نشر و اشاعت اتمام حجت ہے اور ہمیں یقین ہے کہ اس کتاب
کے مطالعہ کے بعد کسی کے پاس خداوند عالم کی بارگاہ میں کوئی عذر نہیں رہ جاتا کہ وہ اہلبیت
علیہم السلام کے ماننے والوں پر اعتراض کرے اور بلا وجہ کیچڑ اچھالے اس لئے کہ اس کتاب میں تقیہ
کے صحیح معنی، قرآن مجید اور تاریخ و احادیث میں اس پر دلالت کرنے والی آیتوں اور واقعات
پر بہترین انداز میں روشنی ڈالی گئی ہے۔

خداوند متعال ہم سب کو اسلامی قوانین اور سنت پیغمبر اکرم پر عمل کرنے کی توفیق عطا
فرمائے۔ وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین۔

حوزہ علمیہ قم

ناصر مکارم شیرازی

۲۳ جمادی الاول ۱۴۱۳ھ

مقدمہ مترجم

بسم اللہ الرحمن الرحیم —— قال الامام جعفر بن محمد الصادق علیہ السلام

"من لا تقیہ لہ، لا دین لہ"

تمام مذاہب کو دیکھ لیجئے مقابلہ میں شیعہ مذہب والوں پر جتنے ستم شاید ہی کسی مذہب
کے ماننے والوں پر ڈھائے گئے ہوں۔ اس کے باوجود شیعہ زندہ رہے، پائندہ رہے اور زندہ
و پائندہ رہیں گے۔ اس حقیقت کا راز یہ ہے کہ جیسے رہبر شیعوں کو ملے اس شان کے رہبر دنیا کے
کسی دوسرے مذہب والوں کو نہیں ملے۔ ان عظیم رہبروں نے تقیہ جیسا ہمہ گیر قانون ہمیں
شیعوں کو دیا۔ دنیا کے کسی مذہب کے پاس ایسا قانون نہیں۔ یہ قانون ہر حالت میں زندگی بخش ہے
یہ قرآنی قانون سب ظلم کے خلاف آواز اٹھانا ہی سکھاتا ہے، اور ظالم کے سامنے اپنی حیثیت
ظاہر کئے بغیر زندگی گزارنے کی تعلیم بھی دیتا ہے۔ جس کے نتیجے میں انسان کو مکمل تحفظ ملتا ہے
وہ قانون ہر انسان کے حق میں مفید نہیں ہو سکتا جو انسان کو تحفظ نہ دے سکے۔ یہ اور بات

ہے کہ تحفظ کی نوعیتیں مختلف ہیں۔ جس طرح کبھی کبھی سر کٹانا یا تحفظ کے منافی نہیں ہوتا ویسے ہی
چہرہ سامنے سے بچانا یا تحفظ کا مصداق نہیں بن پاتا۔ اور یہ حقیقت آشکار بھی ہے اور فطری بھی۔

اسلام کے ایسے ہی قوانین کے مجموعے میں سے ایک قانون کا نام تقیہ ہے۔ اور چونکہ
اسلام دین فطرت ہے لہٰذا تقیہ بھی قانون فطرت ہے۔ جس کا واضح مطلب یہ ہے کہ تقیہ کی مخالفت
اسلام کی مخالفت ہے اور اسلام کی مخالفت کفر ہے۔

تعجب عوام پر نہیں بلکہ مسلمانوں کے ان دانشوروں پر ہے کہ جو تقیہ کا انکار کرنے والوں
کو مورد الزام اور مستحق تعزیر لینے کے بجائے اس قانون فطرت کے ماننے والوں کو مستحق تنقید کہتے ہیں۔
اور وہ بھی صرف زبانی من ترانیوں کے ساتھ وگرنہ ان کی عملی زندگی میں قدم قدم پر تقیہ نظر آتا ہے حتیٰ
اپنے خانگی معاملات تک میں وہ تقیہ پر عمل کرتے نظر آتے ہیں۔ چونکہ کذب سے بچنے کا یہی ایک ذریعہ
ہے۔

زیر نظر کتاب میں تقیہ کے ہر پہلو پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔ اس کتاب میں مطلق تقیہ کو
ایک فقہی قاعدے کے عنوان سے بیان کیا گیا ہے۔ لیکن اس کے باوجود تقیہ کے علل و اسباب کو
بھی بیان کیا گیا ہے۔ اور بے موقع و محل کی جانے والی اہم حاشیوں کا ازالہ بھی ہے۔

تاریخ و حدیث سے تقیہ کے متعدد نمونے پیش کئے گئے ہیں اور قرآن کی کئی آیات سے
استدلال و استنباط کیا گیا ہے۔

اس کے باوجود میں کسی خوش فہمی کا شکار نہیں ہوں کہ اس کتاب کو پڑھنے کے بعد تمام
متعصب راہ راست پر آجائیں گے۔ البتہ وادی تحقیق کی پرخار راہوں پر سفر کرنے والے منزل تک پہنچ
سکتے ہیں۔ ایسے ہی افراد کی تنویر افکار کے لئے ہم تقیہ کے بارے میں مسلمانوں کے معتبر مفسرین کی
آراء نقل کرتے ہیں۔

۱۔ فخر الدین رازی تفسیر کبیر میں (الا ان تتقوا منهم تقاة) کی تفسیر میں تقیہ کے مسئلہ
اسلام میں سے بعض کا ذکر کرتے ہوئے رقم طراز ہیں۔ اگر انسان کفار کے درمیان پھنس جائے اور جان
کا خوف ہو تو وہ زبانی طور پر مدارات کر سکتا ہے۔ اس کا طریقہ یہ ہے کہ وہ صرف زبان سے دشمنی کا
اظہار نہ کرے بلکہ اس سے بالاتر ذومعنی الفاظ میں ان سے دوستی اور رفاقت کا اظہار کر سکتا ہے بشرطیکہ
باطنی طور پر اس کے خلاف عقیدہ رکھتا ہو۔

اس کے بعد چوتھے حکم کے ذیل میں لکھتے ہیں۔

ظاهر الآية يدل ان التقية انما تحل مع الكفار الغالبين
الا ان مذهب الشافعي رضي الله عنه ان الحالة بين المسلمين اذا شاكلت
بين المسلمين والكافرين حلت التقية محاماة على النفس۔

آیت سے ظاہر ہوتا ہے کہ فقط غلبہ رکھنے والے کافروں سے تقیہ جائز ہے۔ لیکن
شافعی کے نزدیک اگر مسلمانوں سے بھی جان کا خطرہ ہو تو تقیہ جائز ہے۔

پانچواں حکم:

التقية جائزة لصون النفس، وهل هي جائزة لصون المال
يحتمل ان يحكم فيها بالجواز لقوله صلى الله عليه وسلم "حرمة
مال المسلم كحرمة دمه" ولقوله (ص) "من قتل دون ماله فهو
شهيد"[1]

ترجمہ: جان بچانے کے لئے تقیہ جائز ہے۔ لیکن کیا مال کی حفاظت کی خاطر بھی

۱۔ تفسیر الفخر الرازی ۸/۱۳۔

جائز ہے یا نہیں؟ احتمال یہ ہے کہ جائز ہو اس لئے کہ نبی اکرمؐ نے فرمایا "مسلمان کی جان کی طرح اس کا مال بھی محترم ہے۔ اس کے علاوہ فرمایا "جو اپنے مال کے دفاع میں قتل کیا جائے وہ شہید ہے۔"

۲۔ زمخشری اسی آیت کے ذیل میں لکھتے ہیں: خدا نے اس صورت میں کفار و مشرکین سے دوستی برقرار رکھنے کی چھوٹ دی ہے جب ان سے جان کا خطرہ ہو۔[1]

۳۔ نسفی کی تفسیر میں ہے۔ "الا ان تتقوا منهم تقاة" یعنی جب کافروں کو غلبہ حاصل ہو اور مسلمانوں کو جان و مال کا خطرہ ہو تو ایسی صورت میں دوستی ظاہر کرنا اور دشمنی کو پوشیدہ رکھنا جائز ہے۔[2]

۴۔ خازن لکھتے ہیں: صرف قتل ہو جانے سے بچنے کے لئے تقیہ جائز ہے۔ بشرطیکہ نیت سالم ہو۔ چونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔[3] "الا من اكره وقلبه مطمئن بالايمان" سورۂ نحل آیہ ۱۰۶۔

۵۔ نیشاپوری "فلا تخشوهم واخشون" کے ذیل میں لکھتے ہیں: اس آیت کریمہ سے معلوم ہوتا ہے کہ خوف کی حالت میں تقیہ جائز ہے۔[4]

۶۔ خطیب شربینی کو ملاحظہ کیجئے۔ "الا من اكره" یعنی جسے کفر کے اظہار پر

۱۔ تفسیر الکشاف ج ۱ ص ۴۲۲
۲۔ تفسیر النسفی حاشیہ تفسیر خازن ج ۱ ص ۲۷۷
۳۔ تفسیر الخازن ج ۱ ص ۲۷۷
۴۔ تفسیر غرائب القرآن ج ۳ ص ۱۷۸

مجبور کیا جائے اور وہ ایسا کرے "وقلبه مطمئن بالايمان" اور اس کا دل ایمان سے سرشار ہو تو اس نے کچھ برا نہیں کیا اس لئے کہ ایمان کا مسکن دل ہوا کرتا ہے۔[1]

۷۔ طبری اپنی تفسیر میں لکھتے ہیں۔ "الا ان تتقوا منهم تقاة" کے ذیل میں ابو العالیہ رقمطراز ہیں۔ تقیہ زبان سے ہوتا ہے عمل سے نہیں ہوتا۔

اس کے بعد اسی آیت کے ذیل میں ضحاک کا قول نقل کرتے ہیں۔ "تقیہ زبان سے ہوتا ہے اگر کسی شخص کو ایسی بات کہنے پر مجبور کیا جائے جس میں خدا کی نافرمانی ہو اور وہ جان بچانے کے لئے کہہ دے "وقلبه مطمئن بالايمان" مگر اس کا دل ایمان سے لبریز ہو تو وہ گنہگار نہیں۔[2]

۸۔ حافظ ابن ماجہ لکھتے ہیں: ایسی حالت میں تقیہ جائز ہے۔ اس لئے کہ خداوند عالم کا ارشاد ہے۔ "الا من اكره وقلبه مطمئن بالايمان"[3]

۹۔ اسی آیت کی تفسیر میں قرطبی لکھتے ہیں۔ "حسن کا قول ہے کہ تقیہ انسان کے لئے قیامت تک جائز ہے۔[4]

اس کے بعد قرطبی کہتے ہیں: "اہل علم کا اتفاق ہے جس شخص کو کفر بکنے پر مجبور کیا جائے اور وہ قتل سے بچنے کے لئے ظاہراً کافر ہو جائے لیکن اس کے دل میں ایمان ہو تو نہ وہ گناہ گار ہوگا اور

۱۔ تفسیر السراج المنیر ج ۲ ص ۲۲۸۔
۲۔ جامع البیان ج ۳ ص ۱۵۳۔
۳۔ سنن ابن ماجہ ج ۱ ص ۵۳
۴۔ جامع احکام القرآن ج ۴ ص ۵۷۔

شافعی مذہب کی بیوی اس سے الگ ہو گی اور اس کا فرزند ترک کر دیا جائے گا، یہ مالک شافعی اور ابو حنیفہ کا قول ہے۔[1]

۱۰۔ اسی آیت کی تفسیر میں آلوسی لکھتے ہیں: آیت تقیہ کے مشروع ہونے پر دلالت کرتی ہے۔[2]

۱۱۔ جمال الدین قاسمی کہتے ہیں کہ آیہ "الا ان تتقوا منهم تقاة" سے تمام محققین نے استنباط کیا ہے کہ خوف کے وقت تقیہ مشروع ہے۔

چنانچہ ابو ہریرہ اقرار کرتے ہیں کہ میں نے رسول خدا سے دو ظرف علم حاصل کیے ہیں، ایک کو میں نے تمام لوگوں کو بتا دیا ہے لیکن دوسرا ظاہر نہیں کیا ہے، اگر بتا دوں تو میری گردن ماری جائے۔[3]

۱۲۔ مراغی نے اپنی تفسیر میں اس آیت کے ذیل میں کہا ہے، مومنوں کو ہر حالت میں کافروں سے قطع روابط کرنا چاہیے، لیکن اگر ان سے کسی قسم کا خوف ہو تو اس کا اظہار تقیہ کے ذریعہ جائز ہے۔ اس لئے کہ قاعدہ شرعیہ ہے کہ منافع حاصل کرنے سے پہلے نقصانات کو دور کرنا چاہیے۔

لہٰذا جب نقصان سے بچنے کے لئے کافروں کے ساتھ دوستی کرنا جائز ہے تو تمام مسلمانوں کے منافع کے لئے بدرجہ اولیٰ جائز ہے۔

دین اور دیانت کے پابند روشن فکر مسلمانوں سے یہ توقع کی جاتی ہے کہ وہ اہل سنت کی تفاسیر میں ملاحظہ فرمانے کے بعد تقیہ کو بہانہ بنا کر مذہب اسلام کے خلاف اٹھنے والوں کا ہم نوا نہیں کریں گے بلکہ ان کی روشن دلیلوں کے ذریعہ حق اور صراط مستقیم پر چلنے کی کوشش کریں گے۔

ممکن ہے کہ بعض ذہنوں میں یہ غلط فہمی پیدا ہو جائے کہ یہ کتاب لکھنے اور ترجمہ کرنے کا مقصد

۱۔ جامع احکام القرآن جلد ۴

۲۔ روح المعانی جلد ۳

۳۔ محاسن التاویل جلد ۴ ـ طبع مصر۔

اہل سنت حضرات کو ان کے مذہب سے جدا کرنا ہے۔ اس غلط فہمی کو دور کرنے کے لئے عرض ہے کہ کتاب کا مقصد کسی کے خلاف پروپیگنڈہ کرنا ہرگز نہیں بلکہ اس کا مقصد حق کو واضح کرنا ہے۔ "لیہلک من هلک عن بینة ویحییٰ من حیّ عن بینة" صرف کتابیں پڑھ لینے سے کوئی شیعہ نہیں بن جاتا بلکہ "ذالک فضل الله یوتیه من یشاء"۔[1]

اگر یہ کتاب نہیں لکھی گئی تھی تب بھی لوگ شیعہ مذہب اختیار کرتے رہے ہیں اور آئندہ بھی کرتے رہیں گے۔

ہماری اس کتاب سے اصل غرض یہ ہے کہ علمائے اسلام اپنی فکری صلاحیتوں کو ان فروعی مسائل میں الجھا کر برباد نہ کریں بلکہ انہیں اپنے مشترکہ دشمن کے ظاہری اور باطنی ہتھکنڈوں سے بچنے کے لئے استعمال کریں۔

اسی طرح جو لوگ اہل تحقیق اور حق جو ہیں ان کو بھی آزادی دیں تاکہ وہ خوف کے خوف سے بے خطر ہو کر وادی تحقیق میں قدم رکھیں اور اپنی قسمت کا فیصلہ خود کریں۔

خداوند متعال ہم سب کو دین اسلام اور مستضعف و بے چارے مسلمانوں کی حمایت میں اپنی فکری اور عملی توانائیوں کو صرف کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

آخر میں ناشر گرامی جناب [illegible] صاحب کا تہ دل سے شکر گزار ہوں جو حسن و خوبی سے دین اسلام اور فقہ جعفری کی خدمت کر رہے ہیں۔ خداوند سبحان موصوف کی توفیقات میں اضافہ فرمائے۔

۱۔ سورۂ جمعہ۔

پروردگار عالم جملہ مومنین و مومنات کو حفظ و امان میں رکھے اور ہمارے امام زمانہ کے ظہور میں تعجیل فرمائے۔

آمین یا رب العالمین

۳ شعبان المعظم سنہ ۱۴۱۳ھ

قمر اللہ سبحانی

حرف آغاز

تقیہ ایک عرصے سے جہاں ہماری پہچان رہا ہے اس کے ساتھ ہی اس کی بنا پر ہمیں بدنام کرنے کی کوشش بھی کی جاتی رہی ہے جس کا سبب اس کے حقیقی معنی اور موارد و وجوہ سے ناآگاہی اور حکم عقل و نقل سے غفلت کے علاوہ کچھ نہیں۔

تقیہ دین کی ضرورت ہے اور اس کا مذہب و دین سے مضبوط تعلق ہے۔ ایک طرف بہت سے فروعی مسائل فقہ کی بنیاد اس پر استوار ہے تو دوسری طرف اس کا تعلق عقائد و کلام سے بھی ہے یہی وجہ ہے کہ جو اس کی حقیقت اور اس کے موارد سے غافل ہیں وہ اسی کو اس کے ماننے والوں کا کمزور پہلو قرار دیتے ہیں۔

اگرچہ ہم اس کے بارے میں ایک فقہی قاعدہ کی حیثیت سے بحث کر رہے ہیں لیکن دوران بحث ہم اس کے دوسرے پہلوؤں پر بھی روشنی ڈالیں گے۔ تاکہ مخالفین کے ان اعتراضات کا کہ جو "ڈوبتے کو تنکے کا سہارا"[۱] کی حیثیت رکھتے ہیں جواب دے سکیں اور اس طرح کے تمام شبہات کی طرح اس کو بھی دور کر سکیں جو ہم سے دوری، عدم اتصال اور ہمارے

اور ہمارے عقاید کو ہم سے نہ لینے بلکہ ایسی کتابوں سے اخذ کرنے کی بنا پر پیدا ہو گئے ہیں جو ہمارے خلاف بہتان تراشیوں اور خرافات سے پر ہیں۔ یہ عداوت یا تو قومی اور مذہبی تعصبات کی بنا پر ہم پر لگائے گئے ہیں یا پھر مسلمانوں کے درمیان تفرقہ ایجاد کرنے، بغض و کینہ کا بیج بونے اور ان کو آپس میں دست و گریباں کر کے کمزور کرنے کے لئے یہ تعصبات منافقوں نے پھیلائے ہیں تاکہ مسلمانوں کا رعب و دبدبہ جاتا رہے جیسا کہ قرآن میں خدا کا ارشاد ہے۔

بہرحال ہم تقیہ کو چند مراحل میں تقسیم کر کے مورد بحث قرار دیں گے

اول: تقیہ کے لغوی اور اصطلاحی معنی

دوم: تقیہ کا حکم تکلیفی یعنی آیا تقیہ جائز ہے یا حرام؟ اگر جائز ہے تو کس مورد میں جائز ہے اور کہاں جائز نہیں؟ اور اس کی دلیلیں ہم پیش کریں گے۔ اس کے علاوہ ہم تقیہ کی دو قسموں یعنی خوفی اور کتمانی پر بھی روشنی ڈالیں گے۔

دوران بحث ہم اس سوال کا بھی جواب دیں گے کہ سید اولیاء بنی امیہ اور بنی عباس کے ادوار میں رشید ہجری اور میثم تمار جیسے رجال تاریخ نے کیوں تقیہ کو چھوڑ کر شہادت کا شیریں جام نوش فرمایا؟ اور کیا ایسے مواقع پر ان کی پیروی ہمارے لئے ممکن ہے یا نہیں؟

تیسرے مرحلے میں۔ ہم اس کے حکم وضعی کو زیر بحث لائیں گے کہ آیا تقیہ صرف مخالف مذہب کے مقابلہ میں ہوتا ہے یا افراد منافق کے مقابلہ میں بھی اس سے استفادہ کیا جاتا ہے؟ اور آیا تقیہ صرف احکام سے متعلق ہے یا موضوعات میں بھی ہوتا ہے؟ ہم یہ بھی دیکھیں گے کہ تقیہ کا سبب آیا خوف شخصی ہے یا خوف نوعی؟ آیا تقیہ کی مخالفت فساد عمل کا باعث بنتی ہے یا نہیں۔ یہ اور ان کے علاوہ دوسری باتیں ان سب کو ہم تنبیہات میں ذکر کریں گے ہم خدا سے تمام امور میں حق کی طرف ہدایت اور توفیق کے طلبگار ہیں۔ انہ قریب مجیب۔

تقیہ کے لغوی اور اصطلاحی معنی

تقیہ لغت میں "تقی یتقی" کا مصدر ہے، اسم مصدر نہیں جیسا کہ شیخ انصاری نے فرمایا ہے بلکہ اسم مصدر تقوی ہے..... چنانچہ محقق فیروزآبادی "قاموس" میں فرماتے ہیں "اتقیت الشئ وتقیتہ اتقیہ تقی وتقیۃ وتقاء ککساء حذرتہ" "میں فلاں چیز سے بچا" گویا کسی بھی چیز سے بچنے کو تقیہ کہا جاتا ہے۔

بہرحال تقیہ کے اس معنی کا دائرہ جو فقہ، اصول اور علم کلام میں بیان ہوئے ہیں لغوی معنی کی بہ نسبت تنگ ہے۔ اس سلسلے میں علماء کرام کی جو عبارتیں اور مضامین ہم تک پہنچے ہیں وہ مختلف ہیں۔ لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ علماء کے درمیان تقیہ کی حقیقت و مفاد کے بارے میں اختلاف ہے بلکہ اس کی حقیقت پر سبھی متفق ہیں۔ بطور نمونہ چند عبارتیں نقل کرتے ہیں۔

۱۔ شیخ مفید علیہ الرحمۃ نے اپنی کتاب "تصحیح الاعتقاد"[1] میں تقیہ کی تعریف یوں بیان کی ہے: حق اور عقیدہ حقہ کو مخالفین سے پوشیدہ رکھنا اور جن چیزوں کے اظہار سے دینی یا دنیوی نقصان کا اندیشہ ہو ان کے ظاہر کرنے سے پرہیز کرنا۔

۲۔ شہیدؒ اپنی "قواعد" میں فرماتے ہیں: لوگوں کے شر سے بچنے کے لئے معروف [illegible] میں ان کے شانہ بشانہ چلنے کو تقیہ کہتے ہیں۔

۳۔ علامہ شیخ انصاریؒ رسالہ "التقیۃ" میں رقمطراز ہیں: "تقیہ سے مراد اپنے کو نقصان سے محفوظ رکھنے کے لئے قول و فعل میں مخالف حق غیر کی موافقت کرنا۔"

۴۔ علامہ شہرستانی مرحوم شیخ مفید کی کتاب "اوائل المقالات" کے حاشیہ پر لکھتے ہیں: اگر کسی امر دینی کے اظہار میں خوف ضرر ہو تو اسے پوشیدہ رکھنا تقیہ کہلاتا ہے۔[2]

اس میں کوئی شک نہیں کہ مذکورہ تعریفوں میں سے بعض کا دائرہ وسیع ہے اور بعض کا تنگ ہے، لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تقیہ کے معنی کی وضاحت کے پیش نظر کسی نے بھی اس کی جامع اور مانع اصطلاحی تعریف کرنے کی کوشش نہیں کی ہے۔ اسی لئے کسی نے دوسرے کی تعریف پر اعتراض بھی نہیں کیا ہے۔

اہم جس چیز کا ذکر ضروری سمجھتے ہیں وہ یہ ہے کہ تقیہ ہر اس جماعت کے لئے [illegible] ہے جس پر اکثریت کا غلبہ ہو اور اکثریت اس اقلیت کو اظہار عقیدہ اور اس کے مطابق عمل

۱۔ التقیۃ کتمان الحق وستر الاعتقاد فیہ ومکاتمۃ المخالفین وترک مظاہرتہم بما یعقب ضررا فی الدین والدنیا۔ تصحیح الاعتقاد ص [illegible]۔

۲۔ اوائل المقالات ص ۹۶۔

کرنے کی اجازت نہ دیتی ہو تو وہ اقلیت اپنے جان و ناموس کو متعصب مخالفوں کی دست برد و غارت گری سے محفوظ رکھنے کے لئے فطرت کے عین مطابق کبھی تو تقیہ کا سہارا لیتے ہیں کیونکہ جب حفظ نفوس و اموال اظہار حق کی بہ نسبت اہم ہوتا ہے، اور جب وہ سمجھتے ہیں کہ اظہار حق یا عقیدہ بے اثر ہے تو تقیہ کو ترک کرتے ہوئے ہر طرح کا نقصان برداشت کرتے ہیں اور آخر کار موت کو گلے لگا لیتے ہیں۔ چنانچہ جب انسان ایسے دوراہے پر کھڑا ہو جس کے ایک طرف اہم اور دوسری طرف مہم ہو تو عقل بھی اہم کو اختیار کرنے کا حکم دیتی ہے اور اسی کا نام تقیہ ہے جو حکم عقل کے عین مطابق ہے۔

لہذا حقیقت یہ ہے کہ نہ فقط شیعہ تقیہ کرتے ہیں اور نہ ہی تقیہ شیعوں سے مخصوص ہے، اگرچہ شیعوں کو بدنام کر دیا گیا ہے۔ بلکہ دنیا میں ہر وہ قوم تقیہ کرتی ہے جو شیعوں جیسی مصیبتوں میں مبتلا ہو۔ شیعوں کے ساتھ تقیہ اس لئے مشہور کر دیا گیا ہے کہ اکثر ادوار میں تقریباً ہر جگہ ظالم مخالفوں کی سلطنت رہی ہے۔ چنانچہ کوئی بھی اقلیت جب ایسی صورت میں ہو تو تقیہ اس کی سرشت میں ثبت ہو جاتا ہے۔

بہت ساری احادیث شاہد ہیں کہ ایسے ہی حالات میں مومن آل فرعون اور اصحاب کہف نے تقیہ کو حفظ دین کا وسیلہ بنایا بلکہ بعض وجوہ کی بنا پر کہا جا سکتا ہے کہ بت پرستوں کی کج بحثی کے مقابلہ میں حضرت ابراہیمؑ نے اور اپنے بھائیوں کے ساتھ مکالمہ میں حضرت یوسفؑ نے تقیہ سے کام لیا ہے۔

تقیہ کا حکمِ تکلیفی

علمائے امامیہ کے نزدیک مشہور یہ ہے کہ تقیہ کی پانچ قسمیں ہیں۔ واجب، حرام، مستحب، مکروہ اور مباح۔ ہماری تحقیق بھی اس کی تائید کرتی ہے۔

ہم اپنی بحث کا آغاز جوازِ تقیہ سے کرتے ہیں۔ اس کے بعد اس کی حرمت اور پھر استحباب و کراہت کو بیان کریں گے...... اس میں کوئی شک نہیں کہ بعض موقعوں پر تقیہ جائز ہے جس کی دلیل ہمارے وجدان، قرآن کے علاوہ احادیث متواترہ اور عقلِ سلیم ہیں۔ پہلے ہم آیات کو ذکر کرتے ہیں...... چنانچہ سورۂ آل عمران میں ارشادِ رب العزت ہے۔ لا یتخذ المؤمنون الکافرین اولیاء من دون المؤمنین ومن یفعل ذلک فلیس من اللہ فی شیء الا ان تتقوا منھم تقاۃ ویحذرکم اللہ نفسہ والی اللہ المصیر (آیت ۲۸)

ترجمہ:

مومن مومنوں کو چھوڑ کر کافروں کو دوست نہ بنائیں جو بھی ایسا کرے گا اس کا خدا سے

کوئی رابطہ نہ ہوگا۔ لیکن اگر ان سے خطرہ لاحق ہو تو ایسا کر سکتے ہیں (یعنی تقیہ کرتے ہوئے ان کو دوست بنا سکتے ہیں، اور ان سے مدد لے سکتے ہیں......) اسی طرح کی ایک آیت ہے جس میں ارشاد ہے۔ یا ایھا الذین آمنوا لا تتخذوا عدوی وعدوکم اولیاء تلقون الیھم بالمودۃ وقد کفروا بما جاءکم من الحق[1] اس آیت میں بھی کافروں کو ولی بنا کر ان کے ساتھ دوستی و مودت بھرا برتاؤ کرنے سے روک دیا گیا ہے۔ اسی قسم کی بات ایک اور آیت میں ہے۔ لا تجد قوما یؤمنون باللہ والیوم الآخر یوادون من حاد اللہ ورسولہ[2]

ترجمہ:

خدا اور اس کے رسول پر ایمان رکھنے والی کوئی بھی قوم ان کے دشمنوں سے مودت نہیں رکھ سکتی...... یہاں تک ذکر کرنے کے بعد تقیہ کی حالت کو مستثنیٰ کر دیا گیا ہے یعنی تقیہ کی حالت میں ان کو ولی بنانا اور ان سے مودت رکھنا جائز ہے۔ اگرچہ حکمِ اولی کے تحت ایسا کرنا حرام ہے...... اس میں کوئی شک نہیں کہ لفظ تقاۃ سے مراد تقیہ ہے۔ اور تقیہ اور تقاۃ دونوں ایک ہی معنی رکھتے ہیں۔ بلکہ حسنؒ اور مجاہدؒ کی قرائتوں میں "تقاۃ" کے بجائے تقیہ ہے...... امین الاسلام طبرسی مجمع البیان میں آیت کے معنی بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر کفار غلبہ رکھتے ہوں اور اہلِ ایمان مغلوب ہوں اور کفار

۱۔ سورۂ ممتحنہ، آیت ۱۔

۲۔ سورۂ مجادلہ آیت ۲۲۔

سکے ساتھ حسن معاشرت اور موافقت دشمن کی صورت میں، مومن کو خوف لاحق ہو تو تقیہ کرتے ہوئے زبانی طور پر اظہار محبت و مودت جائز ہے لیکن دلی اعتقاد نہیں ہونا چاہیے ...... چنانچہ اگر کسی کو جان کا خطرہ ہو تو آیت اس وقت دین میں تقیہ کے جواز پر دلالت کرتی ہے۔ اسی بنا پر اصحاب تشیع ضرورت کے وقت ہر طرح کے اقوال میں تقیہ کو جائز قرار دیتے ہیں۔ اور کبھی لطف و خیر خواہی کے عنوان سے تقیہ اقوال میں واجب ہو جاتا ہے۔ اور افعال میں اگر تقیہ قتل مومن اور دین میں فساد کا باعث بنے تو جائز نہیں ہے۔[1]

شیخ الطائفہ حضرت شیخ طوسیؒ اس آیت کے تحت فرماتے ہیں: جان کے خوف پر تقیہ ہمارے نزدیک واجب ہے۔ اگرچہ اظہار حق کا جواز بھی روایت میں آیا ہے...... ہم حسن روایت کرتے ہیں کہ مسیلمہ کذاب نے حضرت رسالتؐ کے دو صحابیوں کو گرفتار کیا ایک سے پوچھا کیا تم گواہی دیتے ہو کہ محمدؐ اللہ کے رسول ہیں؟ اس نے کہا "ہاں" مسیلمہ نے "کیا تم شہادت دیتے ہو کہ میں اللہ کا رسول ہوں؟" صحابی نے کہا "ہاں" مسیلمہ کذاب نے دوسرے شخص کو بلایا اور اس سے پوچھا "کیا تم گواہی دیتے ہو کہ محمدؐ اللہ کے رسول ہیں؟" اس شخص نے کہا "ہاں" مسیلمہ کذاب نے پوچھا "کیا تم گواہی دیتے ہو کہ میں اللہ کا رسول ہوں؟" صحابی نے جواب دیا: میں بہرا ہوں۔ مسیلمہ کذاب نے تین مرتبہ اس سے پوچھا مگر صحابی نے وہی جواب دیا۔ تب مسیلمہ کذاب نے اسے قتل کر دیا...... خبر جب حضورؐ تک پہنچی تو آنحضرتؐ نے فرمایا: مقتول نے صدق و یقین پر عمل کر کے فضیلت کا مقام حاصل کیا جو اس کیلئے مبارک ہو......

۱۔ مجمع البیان جلد ۲ صفحہ ۴۳۰۔

رہ گیا دوسرا شخص تو اس نے اللہ کی دی ہوئی چھوٹ سے استفادہ کیا ہے لہٰذا وہ معذور ہے۔

اس روایت سے پتہ چلتا ہے کہ تقیہ چھوٹ ہے جب کہ اظہار حق فضیلت ہے حالانکہ ہماری احادیث سے ظاہر ہوتا ہے کہ تقیہ واجب ہے اور اس کی مخالفت خطا ہے۔ یہ تھے شیخ الطائفہ۔ لیکن ہم اپنے قارئین کو عنقریب بتائیں گے کہ بعض مواقع پر تقیہ واجب ہے اور بعض پر جائز۔ کچھ مواقع ایسے ہیں کہ جہاں تقیہ مستحب ہے جب کہ کچھ موارد میں ترک تقیہ اور اظہار حق ضروری ہے۔ اور چونکہ تمام روایات ایک ہی مورد کے لئے نہیں ہیں لہٰذا ان میں تعارض نہیں جو شیخ طوسی کی عبارت سے ظاہر ہوتا ہے...... مختصر یہ کہ آیت بطور اجمال جواز تقیہ پر دلالت کرتی ہے بلکہ آیت میں عنوان تقیہ بطور واضح مذکور ہے۔ اس لئے کہ تقیہ و تقاۃ کے ایک ہی معنی ہیں اور آپ ملاحظہ فرما چکے ہیں کہ ایک سے زیادہ قاریوں نے "تقاۃ" کی جگہ "تقیۃ" کی قرأت کی ہے۔

اسی قبیل کی ایک آیت سورہ نحل میں ہے۔ من کفر باللہ من بعد ایمانہ الا من اکرہ و قلبہ مطمئن بالایمان ولکن من شرح بالکفر صدرا فعلیہم غضب من اللہ ولہم عذاب عظیم ۝ (۱۰۶) اس آیت کے شان نزول میں مفسروں نے جن امور کو ذکر کیا ہے وہ آپس میں قریب المعنی ہیں۔ اگرچہ اشخاص و اماکن میں اختلاف ہے۔

بعض تفسیروں میں ہے کہ مذکورہ آیت حضرت عمار، ان کے والد یاسر، والدہ سمیہ و صہیب، بلال اور [illegible] کی شان میں نازل ہوئی ہے۔ کفار نے ان حضرات کو قید کر کے سخت اذیتیں دیں اور ان کو اسلام اور رسول اکرمؐ سے بیزاری اور کلمہ کفر جاری کرنے پر مجبور کیا۔

حضرت عمارؓ کے والدین نے صاف انکار کر دیا اور اسلام میں پہلے دو شہید ہونے کا شرف حاصل کیا۔

حضرت عمارؓ نے زبان سے وہ کہا جو کفار چاہتے تھے لیکن ان کا دل مطمئن تھا۔ اسی دوران کچھ لوگوں نے حضورؐ کو بتایا کہ عمارؓ کافر ہو گئے۔ آپؐ نے فرمایا کہ عمارؓ سر سے پاؤں تک ایمان میں ڈوبا ہے ایمان اس کے گوشت و خون میں مخلوط ہے۔ اتنے میں دیکھا کہ عمارؓ روتے ہوئے حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ آنحضرتؐ نے پوچھا۔ عمارؓ تمہارے پیچھے کیا خبر ہے؟ عرض کی یا رسول اللہ بری خبر ہے۔ مجھے مجبور کیا گیا کہ میں آپ سے بیزاری ظاہر کروں اور ان کے خداؤں کی تعریف کروں..... آنحضرتؐ نے عمارؓ کے آنسو پونچھے اور فرمایا اگر دوبارہ مجبور کریں تو وہی کہو جو وہ چاہیں..... اس پر آیت نازل ہوئی۔

بعض مفسرین نے لکھا ہے کہ یہ آیت ابوجہل کے بھائی عیاش بن ابو ربیعہ اور ابی جندل وغیرہ کی شان میں اس وقت نازل ہوئی جب مشرکین نے ان کو وہ کہنے پر مجبور کیا جو وہ چاہتے تھے۔ اس کے بعد ان لوگوں نے ہجرت اختیار کی اور جہاد میں حصہ لیا تو یہ آیت نازل ہوئی۔

کچھ مفسرین کا بیان ہے کہ مکہ کے کچھ لوگ ایمان سے مشرف ہو کر جب مدینہ کی جانب روانہ ہوئے تو راستہ میں قریش نے ان کو اظہار کفر پر مجبور کیا۔ تو ان کے مجبوری میں ایسا کرنے پر آیت نازل ہوئی۔

لیکن ان میں پہلا قول زیادہ مشہور ہے... آیت کریمہ ضرورت کے وقت بطور تقیہ اظہار کفر کے جواز پر دلالت کرتی ہے جب انسان کا قصد کفر نہ ہو۔ اگرچہ آیت مقام اکراہ میں نازل ہوئی ہے اور تقیہ میں اکراہ معتبر نہیں ہے۔ بلکہ بغیر اکراہ کے بھی تقیہ جائز ہے۔ لیکن اگر دقت کی جائے تو اکراہ اور تقیہ کے ملاک میں کوئی فرق نہیں ہے۔ اس لئے کہ دونوں کا ملاک ترک مہم کے ذریعہ ضرر اہم کا ازالہ ہے۔

یہ نزول آیت کے عنوان کے اعتبار سے ہے۔ باعتبار دیگر اگرچہ مورد آیت کفر و ایمان سے متعلق ہے۔ لیکن حکم آیت ان دونوں کے علاوہ میں بدرجہ اولیٰ جاری ہے۔ اس لئے کہ جب کفر و ایمان جیسے بنیادی مسئلہ میں تقیہ جائز ہے تو دیگر مسائل میں شرائط کی موجودگی میں قطعی طور پر جائز ہے.......

چنانچہ محقق بیضاوی آیت کی تفسیر میں فرماتے ہیں یہ مجبوری میں کلمۂ کفر کے جواز پر دلالت کرتی ہے اگرچہ دین کے اعزاز کی خاطر اس سے پرہیز کرنا افضل ہے جیسا کہ حضرت عمارؓ کے والدین نے کیا۔ پھر انھوں نے حسن بصری کی گذشتہ روایت نقل کی ہے کہ جو ان دو افراد کے بارے میں ہے جن کو مسیلمہ نے گرفتار کر کے اپنی نبوت کی جھوٹی گواہی دلوانی چاہی تھی ایک نے انکار کیا حضورؐ نے فرمایا کہ پہلے نے پروردگار کی رخصت سے فائدہ اٹھایا جبکہ دوسرے نے حق کو برملا کیا اور وہ اسے مبارک ہو۔

اسی طرح کی ایک آیت سورۂ غافر میں ہے جس میں مومن آل فرعون کا ذکر ہے۔

وقال رجل مؤمن من آل فرعون يكتم ايمانه اتقتلون رجلا ان يقول ربي الله وقد جاءكم بالبينات من ربكم ۚ غافر آیت ۸۲۔

یہ آیت اور اس کے بعد والی آیت مومن آل فرعون کا قصہ اور اپنی قوم کے ساتھ ان کے احتجاج کو بیان کرتی ہے جس کو قرآن نے رضا و قبولیت کی زبان میں پیش کیا ہے...... یہاں تک کہ "یکتم ایمانہ" کو بھی اسی انداز میں نقل کیا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر جان کا خطرہ و خوف ہو تو کتمان ایمان جائز ہے بیشک کتمان ایمان صرف ایمان کے ظاہر نہ کرنے سے ممکن نہیں بلکہ اس کے لئے ایمان کے خلاف بھی اظہار کرنا پڑتا ہے۔ خصوصاً ایسے موقع پر جب کتمان ایمان کا زمانہ مومن آل فرعون کی طرح طولانی ہو۔ اس وقت کفار کے ساتھ اعمال میں اشتراک اور دینی مخصوص اعمال ترک کئے بغیر ممکن نہیں کہ انسان ایمان کو پوشیدہ رکھ سکے......

بہر حال یہ کہنا کہ کتمان ایمان کا مطلب حق کے خلاف کچھ کہے بغیر حق کا اظہار نہ کرنا ہے تو یہ
صرف زبانی دعویٰ ہوگا۔ خاص طور سے ابن عباس کی نقل کے مطابق اس وقت کل زمین میں مومن آل
فرعون جن کو حضرت موسیٰ نے مومن بنایا تھا اور فرعون کی بیوی کے بغیر کوئی مومن تھا ہی نہیں ......
اب اگر کوئی شخص ایسے موقع پر خلاف ایمان کچھ کہہ دے تو اسے تقیہ کہا جاتا ہے۔ اور آیت بطور
اجمال اس پر دلالت کرتی ہے ...... چنانچہ طبرسی نے امام جعفر صادقؑ سے نقل کیا ہے کہ آپ نے
فرمایا: التقیۃ دینی ودین آبائی ولا دین لمن لا تقیۃ لہ والتقیۃ ترس اللہ
فی الارض لان مومن آل فرعون لو اظہر الاسلام لقتل۔

مجمع البیان جلد [illegible] ص [illegible]

ترجمہ:

تقیہ میرا اور میرے آباء و اجداد کا دین ہے جس کے پاس تقیہ نہیں اس کے پاس
دین نہیں۔ یہ زمین پر اللہ کی سپر ہے۔ چنانچہ مومن آل فرعون اگر اسلام کو ظاہر کر دیتے تو قتل کر
دیئے جاتے ...... مذکورہ بیان سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ ہر دو تفاسیر جان کے خطرے کے وقت
واضح طور پر تقیہ کو واجب قرار دیتی ہیں۔ روایات جو ہم ان شاء اللہ ذکر کریں گے ان سے ظاہر ہوگا
کہ موارد تقیہ بھی محدود نہیں جو گذشتہ آیتوں میں بیان ہوئے بلکہ عمل اصحاب کہف اور شیخ
الانبیاء حضرت ابراہیمؑ کا بت توڑنے کے بعد اپنی قوم کے سامنے جواب، حضرت یوسفؑ کی اپنے
بھائی کو اپنے پاس روکنے کے وقت بھائیوں سے گفتگو وغیرہ سب کچھ تقیہ پر مبنی تھا جس کے
بارے میں ہم عنقریب عرض کریں گے کہ تقیہ صرف جان کے خطرے کے وقت حق کو چھپانے
اور اس کے خلاف ہونے کا نام ہی نہیں بلکہ کچھ دوسرے مصالح کی بنا پر بھی اگر حق کو چھپایا جائے تو
اسے تقیہ کہتے ہیں۔ ..... بہر کیف یہ تھا تقیہ کے جائز ہونے کے بارے میں قرآن کریم کا
جلی اور روشن فیصلہ۔

احادیث تقیۃ

مواقع خوف میں عمل تقیہ کے جواز پر دلالت کرنے والی احادیث کے متواتر ہونے
میں شک نہیں۔ یہ احادیث چند حصوں میں منقسم ہیں۔ اور ہر ایک حصہ بعض خصوصیات
تقیہ کے بارے میں ہے۔ مذکورہ احادیث بے شمار فوائد و لطائف پر مشتمل ہیں ..... جن میں تقیہ
کے اسباب و نتائج، کیفیت، حقیقت، اقسام اور موارد وجوب و حرمت کے علاوہ ان مقامات
کی نشاندہی کی گئی ہے جہاں تقیہ نہیں کیا جاتا۔

یہ احادیث "وسائل" کی گیارھویں جلد کتاب امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے
بہت سے ابواب میں مذکور ہیں۔ چنانچہ .....

ہماری تقسیم کے مطابق یہ احادیث پانچ طائفوں پر مشتمل ہیں۔

پہلا طائفہ

ان احادیث پر مبنی ہے جو تقیہ کو مومن کے لئے سپر، حرز جان اور محافظ نفس قرار دیتی

ہیں۔ اس معنی کے تحت بہت ساری احادیث ہیں۔ جن میں سے بعض درج ذیل ہیں۔

۱۔ کلینی کافی میں اپنی سند کے ساتھ معمر بن مروان کے واسطہ سے ابی عبداللہ ؑ سے ناقل ہیں، آپ نے فرمایا میرے والد محترم فرمایا کرتے تھے کہ "تقیہ سے زیادہ کوئی چیز میری آنکھوں کی ٹھنڈک نہیں ہو سکتی۔ اس لئے کہ تقیہ مومن کی سپر ہے۔"[1]

۲۔ کافی میں کلینی عبداللہ ابن ابی یعفور سے روایت کرتے ہیں۔ ابی یعفور راوی ہیں کہ میں نے ابی عبداللہ کو فرماتے ہوئے سنا ہے: "تقیہ مومن کے لئے سپر اور حرز جان ہے۔"[2]

۳۔ کلینی نے کافی میں حریز کے حوالہ سے ابی عبداللہ سے نقل کیا ہے آپ نے فرمایا "تقیہ اللہ اور اس کے بندوں کے درمیان اس کی سپر ہے۔"[3]

۴۔ سعد ابن عبداللہ نے بصائر الدرجات میں جمیل بن صالح کے واسطہ سے ابی عبداللہ سے نقل کیا ہے: "آپ نے فرمایا کہ میرے بزرگوار فرمایا کرتے تھے۔ تقیہ سے زیادہ کوئی چیز میری آنکھوں کی ٹھنڈک نہیں۔ اس لئے کہ تقیہ مومن کی سپر ہے۔"[4]

۱۔ عن ابی عبداللہ ؑ قال: کان ابی یقول: وای شیء اقر لعینی من التقیۃ، ان التقیۃ جنۃ المؤمن۔ وسائل جلد ۱۱

۲۔ قال سمعت ابا عبداللہ یقول: التقیۃ ترس المؤمن والتقیۃ حرز المؤمن۔ وسائل جلد ۱۱

۳۔ عن حریز عن ابی عبداللہ ؑ قال: التقیۃ ترس اللہ بینہ وبین خلقہ۔ جلد ۱۱ باب ۲۴ الامر بالمعروف۔

۴۔ عن جمیل بن صالح عن ابی عبداللہ ؑ قال: کان ابی یقول: وای شیء اقر لعینی من التقیۃ ان التقیۃ جنۃ المؤمن۔

یہ روایات اس امر پر دلالت کرتی ہیں کہ جس طرح حفاظت میدان جنگ میں دشمن کے وار سے محفوظ رہنے کے لئے سپر کا استعمال لازمی ہے اسی طرح حفظ نفس کے لئے تقیہ کا سہارا لے سکتا ہے اور چونکہ دشمن کے حملہ سے بچنے کے لئے سپر کا استعمال واجب ہے لہذا کہا جا سکتا ہے کہ تقیہ کے ذریعہ بھی دشمن سے مخفی رہنا واجب ہے۔ ..... اب اگر کوئی ان روایات کی وجوب تقیہ پر دلالت کو تسلیم نہ بھی کرے جب بھی جواز تقیہ پر ان کی دلالت سے انکار نہیں کر سکتا۔

دوسرا طائفہ:

وہ روایات ہیں کہ جو تقیہ کے نہ ہونے کی صورت میں دین اور ایمان کی نفی کرتی ہیں اور کہتی ہیں کہ تقیہ دین ہے اور تقیہ کے بغیر دین ناقص ہے

۵۔ کلینی نے کافی میں اپنی سند کے ساتھ ابی عمر عجمی سے روایت کی ہے۔ عجمی کہتے ہیں مجھ سے ابو عبداللہ ؑ نے فرمایا: "اے ابو عمر! دین کے دس حصوں میں سے نو حصہ تقیہ میں ہیں اور جس کے پاس تقیہ نہیں اس کے پاس دین نہیں۔"[5]

۶۔ علل الشرائع میں صدوق ؒ ابو بصیر سے ناقل ہیں کہ امام جعفر صادق ؑ نے فرمایا تقیہ خدا عز وجل کا دین ہے۔ میں نے عرض کی اللہ کے دین میں سے ہے؟ آپ نے فرمایا: ہاں

صفحہ گذشتہ کا بقیہ حاشیہ۔

ان التقیۃ جنۃ المؤمن۔ ج ۲۳۲ باب ۲۴ الامر بالمعروف۔

۵۔ عن ابی عمر الاعجمی قال: قال ابو عبداللہ ؑ: یا ابا عمر ان تسعۃ اعشار الدین فی التقیۃ ولا دین لمن لا تقیۃ لہ۔ ج ۲ باب ۲۴ کتاب امر بالمعروف۔

خدا کی قسم! تقیہ میرے دین میں سے ہے۔[1]

۷۔ صدوقؒ صفات الشیعہ میں ابان بن عثمان کے ذریعے امام صادقؑ سے نقل کرتے ہیں۔ حضرتؑ نے فرمایا: "جو تقیہ نہیں رکھتا وہ دین دار نہیں اور جس کے پاس ورع نہیں وہ ایمان دار نہیں ہے۔"[2]

۸۔ یہ وہ روایت ہے جس کو کلینی نے ابن ابی یعفور کے حوالے سے امام صادقؑ سے نقل کیا ہے جس میں آپ نے فرمایا: "جس کے پاس تقیہ نہیں وہ ایمان نہیں رکھتا۔"[3]

ان کے علاوہ بھی بہت سی روایات ہیں۔

ان روایات سے بطور اجمال ظاہر ہوتا ہے کہ مقامات تقیہ میں تقیہ واجب ہے اور یہ کہ تقیہ دین کے اہم اور عمدہ مسائل میں سے ہے۔ عنقریب ہم اس کی تاکید کی علت بیان کریں گے اور اگر اس کی حدود و شرائط کی رعایت کی جائے تو تقیہ فطری امر ہے جس کی گواہی ہر انسان کا ضمیر دیتا ہے۔

تیسرا طائفہ:

اس طائفہ کی روایات بیان کرتی ہیں کہ تقیہ عظیم ترین فرائض میں سے ہے۔ اللہ کے

۱۔ عن ابی بصیر قال ابو عبد اللہ التقیۃ من دین اللہ، قلت من دین اللہ؟ قال ای واللہ من دین اللہ ... ج ۸، باب ۲۴ کتاب امر بالمعروف۔

۲۔ عن ابان بن عثمان عن الصادق: لا دین لمن لا تقیۃ له ولا ایمان لمن لا ورع له۔ ج ۲۴، باب ۲۴ کتاب امر بالمعروف۔

۳۔ عن ابن ابی یعفور عن الصادق: لا ایمان لمن لا تقیۃ له، الحدیث۔ ج ۹، باب ۲۴ کتاب امر بالمعروف

نزدیک سب سے محبوب وہ ہے جو سب سے زیادہ تقیہ پر عمل کرتا ہو اور ایمان بغیر تقیہ کے بے سر کے تن جیسا ہے اور مقام تقیہ میں خدا اور اس کے اولیاء کے نزدیک کوئی چیز تقیہ سے زیادہ پسندیدہ نہیں۔ روایات درج ذیل ہیں۔

۹۔ کلینیؒ نے کافی میں حبیب ابن بشر سے نقل کیا ہے کہ ابو عبد اللہؑ نے فرمایا میں نے اپنے باپ کو فرماتے ہوئے سنا کہ روئے زمین پر تقیہ سے زیادہ پسندیدہ کوئی چیز نہیں۔ اے حبیب! جس کے پاس تقیہ کا ہتھیار ہو خدا اسے رفعت عطا فرماتا ہے۔ اے حبیب! جس کے پاس تقیہ نہ ہو خدا اسے نیچا دکھاتا ہے۔ اے حبیب! لوگ غیبت میں بسر کر رہے ہیں۔ اگر غیبت کا زمانہ ختم ہوا اور امام کا ظہور ہو جائے تو تقیہ واجب نہیں رہے گا۔[1]

۱۰۔ قول پروردگار متعال "وعملوا الصالحات" کی تشریح میں تفسیر امام حسن عسکریؑ میں منقول ہے: آنحضرتؑ نے فرمایا: "اس قول کا مطلب توحید کے بعد تمام فرائض کی انجام دہی اور نبوت و امامت کا اعتقاد رکھنا۔ لیکن سب سے بڑے دو فرائض ہیں۔ اپنے دینی بھائیوں کے حقوق ادا کرنا اور دشمنوں سے بچنے کے لئے تقیہ کا سہارا لینا۔"[2]

گذشتہ بارہ وسائل کے اکتیسویں باب یعنی باب امر بالمعروف اور نہی عن المنکر میں موجود حدیث نبوی ہیں اور امام حسن عسکریؑ تک ایک ایک معصوم امام سے منقول ہے کل ملا کر تیرہ حدیثیں ہیں اور ہر حدیث امام کی تفسیر اور اس کی وساطت سے منقول ہے۔ صاحب وسائل نے آئمہؑ کی ترتیب کے تحت ان کو نقل کیا ہے۔ اگرچہ ان کی عبارتیں اور الفاظ مختلف

۱۔ ج ۸ - باب ۲۴ - ابواب امر بالمعروف۔

۲۔ ج ۱۰، باب ۲۹ ابواب امر بالمعروف۔

لیکن سبھی ایک مطلب کی طرف رہنمائی کرتی ہیں اور وہ یہ کہ ائمہ علیہم السلام کے نزدیک بہترین چیز اور ان کا پسندیدہ اخلاق، تقیہ اور دینی بھائیوں کے حقوق کی ادائیگی ہے۔ ان کے نزدیک ترک تقیہ ناقابل بخشش گناہوں میں سے ہے۔

۱۱۔ تفسیر امام حسن عسکریؑ میں ہے کہ پیغمبر اسلامؐ نے فرمایا: بغیر تقیہ کے مومن ایسا ہی ہے جیسا بغیر سر کے بدن۔[1]

۱۲۔ امیر المومنینؑ نے فرمایا: تقیہ مومن کے اعمال میں سے بہترین عمل ہے جس کے ذریعہ وہ اپنے نفس اور اپنے بھائیوں کو ظالموں سے محفوظ رکھتا ہے۔[2]

یہ حدیث اس امر کی شاہد ہے کہ تقیہ صرف اپنی جان بچانے کے لئے نہیں ہوتا بلکہ اپنے بھائیوں کی جان بچانے کے لئے بھی ہوتا ہے۔ البتہ آگے چل کر تنبیہات میں عرض کریں گے کہ وہ مومن بھائی جن کے لئے تقیہ کیا جاتا ہے ان کا معلوم و مشخص ہونا ضروری ہے۔ یا غیر معین کے لئے بھی تقیہ جائز ہے۔ چاہے اشخاص معلوم نہ ہوں۔؟

۱۳۔ امام حسن عسکریؑ اپنے جد بزرگوار امام زین العابدینؑ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا: "خدا مومن کے ہر گناہ کو بخش دیتا ہے اور اس کو دنیا و آخرت میں ہر گناہ کی آلودگی سے پاکیزہ بنا دیتا ہے۔ مگر دو گناہوں کو نہیں بخشتا۔ ایک ترک تقیہ اور دوسرے اپنے بھائیوں کے حقوق پامال کرنا۔"[3]

۱۔ ج ۲۔ باب ۲۸۔ الامر بالمعروف۔

۲۔ عن امیر المومنین (ع) التقیة من افضل اعمال المومنین یصون بها نفسه و اخوانه عن الفاجرین۔ ج ۲۔ باب ۲۸۔ الامر بالمعروف۔

بقیہ آئندہ صفحہ۔

۱۴۔ امام محمد باقرؑ کی خدمت میں عرض کیا گیا کہ فلاں شخص ایک تہمت میں پکڑا گیا اور اسے سو کوڑے لگائے گئے۔ تو آپ نے فرمایا کہ اس نے مومن کا حق پامال کیا تھا اور تقیہ کو ترک کیا تھا اور پھر جب متوجہ ہوا تو اس نے توبہ کی۔[1] یہ روایت اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ ترک تقیہ صرف عذاب اخروی کا ہی باعث نہیں بنتا بلکہ دنیاوی عذاب کا باعث بھی بنتا ہے۔

۱۵۔ علی ابن محمد الخزاز نے حسین ابن خالد کے حوالے سے امام رضاؑ سے نقل کیا ہے۔ آپ نے فرمایا: جس کے پاس ورع نہیں وہ دین سے خالی ہے اور جس کے پاس تقیہ نہیں وہ ایمان سے بے بہرہ ہے۔ اللہ کے نزدیک تم میں سب سے با عزت وہ ہے جو سب سے زیادہ تقیہ پر عمل کرتا ہو۔ عرض کیا گیا اے فرزند رسولؐ تقیہ کب تک؟ آپ نے فرمایا: قائمؑ کے قیام تک۔ جو قائمؑ کے ظہور سے پہلے تقیہ ترک کر دے وہ ہم سے نہیں ہے۔[2]

صفحہ گزشتہ کا بقیہ۔ ۳۔ عن علی بن الحسین (ع): یغفر اللہ للمومن کل ذنب و یطهره منه فی الدنیا والآخرة ما خلا ذنبین ترک التقیة و تضییع حقوق الاخوان۔ ج ۲۔ باب ۲۸۔ الامر بالمعروف

۱۔ قیل له [illegible] ان فلاناً [illegible] ضرب مائة سوط فقال [illegible] انه ضیع حق اخ مومن و ترک التقیة فوجه الیه فتاب۔ ج ۱۔ باب ۲۸ الامر بالمعروف

۲۔ علی بن محمد الخزاز عن الحسین بن خالد عن الرضا (ع) قال: لا دین لمن لا ورع له و لا ایمان لمن لا تقیة له، ان اکرمکم عند اللہ اعملکم بالتقیة۔ قیل یا ابن رسول اللہ الی متی؟ قال: الی یوم القائم فمن ترک التقیة قبل خروج قائمنا فلیس منا۔ ج ۲۔ ۲۵۲۔ باب ۲۳۔ الامر بالمعروف۔

چوتھا طائفہ

وہ احادیث جو افعال انبیاء میں تقیہ کی نشاندہی کرتی ہیں اور بتاتی ہیں کہ انبیاء سلف نے کئی مواقع پر تقیے سے کام لیا ہے۔ روایات درج ذیل ہیں۔

۱۶۔ صدوقؒ نے "علل" میں ابی بصیر کے حوالے سے امام محمد باقرؑ سے نقل کیا ہے۔ آپ نے فرمایا: اس شخص کے پاس کوئی خیر نہیں جو تقیہ پر عمل نہیں کرتا جبکہ حضرت یوسفؑ نے تقیہ پر عمل کرتے ہوئے فرمایا: "اے قافلہ والو تم چور ہو" حالانکہ انھوں نے چوری نہیں کی تھی۔[1]

اس میں کوئی دو رائے نہیں کہ حضرت یوسفؑ نے بذات خود یہ ارشاد نہیں فرمایا بلکہ چونکہ آپ کے مرد آپکی رعایت سے آپکے اشخاص نے یہ جملہ کہا ہے لہٰذا اس کی نسبت حضرت یوسفؑ کی طرف دی گئی ہے۔ اس لئے کہ قافلہ والوں نے اس وقت کوئی چوری نہیں کی تھی البتہ پہلے انھوں نے حضرت یوسفؑ کو چرایا تھا لہٰذا حضرت یوسفؑ کا مؤذن سے یہ جملہ کہلوانا جھوٹ نہیں بلکہ ایک قسم کا توریہ ہے۔ لیکن یہ توریہ بھی بعض مصالح کے تحت برائے تقیہ حق کو پوشیدہ رکھ کے حضرت بنیامین کو اپنے پاس روک لینے کی خاطر کروایا گیا۔

اور یہ بھی واضح رہے کہ یہ تقیہ بھی جان کے خطرے کو ٹالنے کے لئے نہیں بلکہ دوسرے مصالح کی بنا پر ہے۔ عنقریب ہم بیان کریں گے کہ تقیہ صرف خوف ہی کی بنا پر نہیں ہوتا۔

۱۔ عن ابی بصیر قال سمعت ابا جعفر علیہ السلام یقول: لا خیر فیمن لا تقیۃ لہ ولقد قال یوسف "ایتها العیر انکم لسارقون" وما سرقوا۔ ج ۱۱ باب ۲۴۔ الامر بالمعروف۔

البتہ واضح رہے کہ تقیہ کی یہ قسمیں بیان احکام اور تبلیغ رسالت میں نہیں جس کی بنا کسی کو یہ وہم ہو کہ انبیاء و مرسلین کے لئے تقیہ جائز نہیں۔ بلکہ یہ باب تبلیغ کے علاوہ بعض مصالح کی حفاظت کے لئے ہیں۔

۱۷۔ اس روایت کو بھی حضرت صدوقؒ نے "علل" میں ابوبصیر کے واسطے سے امام جعفر صادقؑ سے نقل کیا ہے۔ امامؑ نے فرمایا: "تقیہ دین پروردگار کا حصہ ہے" میں نے عرض کی "تقیہ دین خدا کا جز ہے؟" تو آپ نے فرمایا "خدا کی قسم ایسا ہی ہے۔ اسی لئے حضرت یوسفؑ نے فرمایا اے قافلہ والو! تم نے چوری کی ہے، حالانکہ خدا کی قسم انھوں نے کچھ نہیں چرایا تھا۔"[1]

...... اس روایت کی توجیہ بھی وہی ہے جو گذشتہ روایت کی ہے۔

۱۸۔ اس روایت کو کلینی نے کافی میں ابوبصیر کے حوالے سے حضرت ابو عبداللہؑ سے نقل کیا ہے۔ آپ نے فرمایا تقیہ دین الٰہی کا جز ہے۔ اس کے بعد وہی پہلی روایت والے فقرے ارشاد فرمانے کے بعد امامؑ نے اضافہ فرمایا: "بے شک حضرت ابراہیمؑ نے فرمایا "میں بیمار ہوں" جبکہ خدا کی قسم وہ بیمار نہیں تھے۔"[2]

۱۔ عن ابوبصیر قال: قال ابو عبداللہ: التقیۃ من دین اللہ، قلت من دین اللہ؟ قال: ای واللہ من دین اللہ ولقد قال یوسف "ایتها العیر انکم لسارقون" واللہ ما کانوا سرقوا شیئاً۔ ج ۱۱ باب ۲۴۔ الامر بالمعروف۔

۲۔ الکافی عن ابی بصیر ایضاً قال: قال ابو عبداللہ: التقیۃ من دین اللہ، ثم روی نحو الروایۃ السابقۃ ثم زاد قولہ: ولقد قال ابراہیم "انی سقیم" واللہ ما کان سقیماً۔ ج ۱۱۔ باب ۲۵۔ الامر بالمعروف۔

جناب ابراہیمؑ کے اس قول کو صرف اس بنا پر تقیہ کہا جا سکتا ہے کہ انھوں نے بعض
مصلحتوں کی بنا پر اپنی حالت کو پوشیدہ رکھا۔ یہ احکام میں تقیہ نہیں بلکہ یہ موضوعات میں ہے
جو آپ کی رسالت سے منافات نہیں رکھتا۔ بلکہ یہ بہت شکلی عین طور رسالت ہے۔

۱۹۔ معانی الاخبار میں سفیان بن سعید کہتے ہیں، میں نے امام جعفر صادق علیہ السلام
سے سنا ہے۔ آپ نے فرمایا تم پر تقیہ لازمی ہے اس لئے کہ بے شک تقیہ سنت خلیل خدا ہے
یہاں تک کہ آپ نے فرمایا، رسول خدا جب سفر کا ارادہ فرماتے تھے تو اپنے خاندان والوں کے
ساتھ مدارات کرتے تھے اور فرماتے تھے مجھے میرے پروردگار نے لوگوں کے ساتھ مدارات کا حکم
دیا ہے۔ بالکل اسی طرح جس طرح سے ادائے فرائض پر مامور فرمایا ہے۔ خدا نے آنحضرت کو تقیہ
کا طریقہ بتاتے ہوئے فرمایا، " ادفع بالتی ہی احسن فاذا الذی بینک و بینہ عداوۃ
کانہ ولی حمیم وما یلقاہا الا الذین صبروا " اے سفیان جو دین خدا میں تقیہ
استعمال کرتا ہے وہ قرآن سے بہرہ یاب ہو کر فائدہ اٹھاتا ہے۔ بے شک مومن کی عزت زبان
کی حفاظت میں ہے۔ جو شخص اپنی زبان کا مالک نہیں وہ ندامت اٹھاتا ہے۔[1]

یہ روایت شاہد ہے کہ پیغمبر اسلامؐ بھی بعض موضوعات میں لوگوں کے ساتھ مدارات اور
قلوب مومنین سے بغض و عداوت دور کرنے کی خاطر تقیہ سے کام لیا کرتے تھے جب کہ احکام
تبلیغ رسالت میں ہرگز تقیہ نہیں کرتے تھے۔

اس روایت میں اس طرف بھی اشارہ ہے کہ بتوں کے سلسلے میں حضرت ابراہیمؑ
کا تقیہ یہ کہتے ہوئے کہ میں بیمار ہوں یا حضرت کا یہ فرمانا " یہ ان کے بڑے نے کیا ہے " یا یہ قول کہ

۱۔ ج ۱۱ ۔ باب ۲۴ ۔ ابواب امر بالمعروف۔

" بلکہ ان کے بڑے نے یہ فعل انجام دیا ہے " حضرت ابراہیم کی سنت ہے اور یہ تقیہ کے
ایک وسیع مفہوم میں داخل ہے جو بعض اہم مصالح کی خاطر کسی اہم امر کو پوشیدہ رکھنا کا
ہے۔

۲۰۔ کلینی نے ہشام بن سالم کے حوالے سے امام جعفر صادقؑ سے روایت نقل کی ہے
کہ آپ نے فرمایا۔ بے شک ابو طالب کی مثال اصحاب کہف جیسی ہے جنھوں نے ایمان کو پوشیدہ
رکھا اور شرک کا اظہار کیا پس خدا نے ان کو دوہرا اجر عطا فرمایا۔[1]

مذکورہ روایت اگرچہ نبیوں کے تقیہ کے بارے میں نہیں تاہم ہم نے اس کو نبیوں کے تقیہ
سے ملحق کر کے ذکر کیا ہے ...... قرآن مجید میں اصحاب کہف کا قصہ موجود ہے۔ لیکن
اس میں لفظ تقیہ صراحت کے ساتھ موجود نہیں۔ مگر قرآن سے پتہ چلتا ہے کہ اصحاب کہف
اپنے دشمنوں سے تقیہ کرتے تھے اور آخر میں اپنی قوم سے کنارہ کشی کر کے انھوں نے اپنے راز
فاش ہو جانے کے نتیجہ میں بادشاہ کی سختیوں کے خوف سے ایک غار میں پناہ لے لی۔ اگر وہ اپنے
دین کو ظاہر کر دیتے تو قتل کر دیئے جاتے۔ اسی لئے وہ ایک عرصہ تک اپنا ایمان چھپائے رہے
یہاں تک کہ خدا نے ان کو ہجرت کر جانے کی توفیق عطا فرما دی۔ وہ اظہار ایمان کی فرصت کی تلاش
میں اپنی قوم کے درمیان سے ہجرت کر گئے لیکن ان کو تقیہ میں رہ کر اظہار شرک کرنا پڑا۔
...... مطالب اور روایات کے علاوہ بے شمار شواہد موجود ہیں۔ اگرچہ لفظ تقیہ سے استناد
نہیں کیا گیا ہے لیکن مطلب اتنا واضح ہے کہ لفظ تقیہ کے ذکر کی ضرورت نہیں۔

یہ روایت پیغمبر اسلامؐ کے عم بزرگوار جو دل و جان سے حضورؐ کی حمایت میں کوشاں

۱۔ ج ۱۱ ۔ باب ۲۹ ۔ ابواب امر بالمعروف۔ اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ ابو طالب نے شرک کا اظہار کیا (مترجم)

رہتے تھے کہ تقیہ پر بھی دلالت کرتا ہے ..... البتہ ان کا تقیہ کرنا موانع پر ان کے اظہار ایمان سے منافات نہیں رکھتا جیسا کہ تاریخ و روایات سے پتہ چلتا ہے..... مگر حضرت ابو طالب اگر تقیہ کرتے تھے نہ ہمیشہ اور وہ بھی دشمنوں سے ہوتا تھا نہ کہ دوستوں سے شاید اسی وجہ سے مخالفین نے ان پر معاذ اللہ مشرک ہونے کا الزام لگایا ہے۔

بہر حال یہ روایات کہ ہے کہ ان موارد تقیہ میں اس کے استحباب یا وجوب پر دلالت کرتی ہیں جن میں مفاد حق وجوب ہوتا ہے کہ رجحان رکھتا ہو...... اس کے علاوہ اور بھی بہت سی روایات ہیں جو تقیہ کے رجحان یا وجوب پر دلالت کرتی ہیں۔ چنانچہ آئندہ بحثوں میں ہم ان روایات کو ذکر کریں گے اور چونکہ یہ روایات متواتر ہیں لہٰذا اصل وجوب تقیہ میں کوئی شک نہیں رہ جاتا۔

چند ضروری امور

اول۔ تقیہ میں اسقدر تاکید کی علت اور سبب کیا ہے؟

اس کا جواب پیش کرنے سے پہلے ہم سوال کی وضاحت کر دیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ان روایات کا مطالعہ کرنے کے بعد انسان اس نتیجہ پر پہنچتا ہے کہ تقیہ میں اتنی تاکید ہے جو دوسرے مسائل میں کم نظیر ہے۔ چنانچہ اس کی وجہ سے وحشت اور بدظنی میں مبتلا ہوتا ہے کہ یہاں کیا ماجرا کیا ہے؟ حالانکہ یہ وحشت اور بدگمانی تقیہ کے اسرار و رموز نہ جاننے کی بنا پر ہے...... اس کے برعکس اگر انسان تقیہ اور اس کی شرعیت کے بارے میں تدبر سے کام لے کر ان شواہد کا مطالعہ کرے جو اس میں موجود ہیں تو اس کا راز اس کے سامنے منکشف ہو کر تقیہ کی حقیقی تصویر پیش کرے گا جس کے نتیجہ میں یہ فیصلہ کرنے پر مجبور ہو گا کہ امر تقیہ میں اسقدر اہتمام کی دو بڑی وجہیں ہو سکتی ہیں۔

پہلی وجہ:

یہ ہے کہ شیعوں میں سے عوام کی اکثریت اور بعض خواص اموی اور عباسی جیسی فاسد حکومتوں کے سامنے با خوف و خطر اور بغیر کسی دلیل قطعی کے اظہار حق کر کے اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈال دیتے تھے۔ ...... گویا ان کا نظریہ یہ تھا کہ اعلان حق ضروری ہے چاہے وہ منفعت بخش اور واجب بھی ہو اور اس کو پوشیدہ رکھنا حرام ہے چاہے وہ مذہب اور اس کے مقدسات کے لئے باعث ضعف و خطر ہی ہو۔ بلکہ چاہے اخفاء حق خود ہی باعث حفاظت المذہب اور اس کے مقدسات کے لئے مفید ہی کیوں نہ ہو ...... یا ......

...... وہ یہ خیال کرتے تھے کہ تقیہ جھوٹ ہے اور کلمہ کفر کا زبان پر لانا شرک و کفر ہے چاہے دل ایمان سے مطمئن ہی کیوں نہ ہو۔ اس لئے کہ کلمہ کفر کے اظہار کے بعد عمار پھوٹ پھوٹ کر روئے اور انہوں نے یہ گمان کیا کہ وہ اسلام سے خارج ہو گئے ہیں جو ان کے لئے ہلاکت کے مترادف ہے ...... چونکہ صورت حال یہی تھی لہٰذا ائمہ معصومین علیہم السلام نے ایسے غیر مفید اعمال سے روکا اور ان کی باطل آراء کو رد کر دیا جس کی دلیل یہ ہے کہ انہوں نے ایسے موارد میں تقیہ کو سپر اور ڈھال وغیرہ سے تعبیر کیا۔

اس کے علاوہ امام جعفر صادق کی وہ روایت ہے کہ جس کو حذیفہ نے پروردگار عالم کے اس قول "ولا تلقوا بایدیکم الی التہلکۃ" کے بارے میں نقل کیا ہے۔ امام نے فرمایا کہ یہ تقیہ کے بارے میں ہے[1] ...... اور ...... شاید روایات

۱۔ ج ۳۵۔ باب ۲۴۔ الامر بالمعروف۔

کہ جس میں انبیاء اور اولیاء کے تقیہ کا تذکرہ ہے اس امر کی بہترین دلیل ہیں کہ تقیہ ترک کرنا ممنوع ہے اور یہ کفر اور دین سے خارج ہو جانے کا موجب ہے بشرطیکہ موقع ہو۔ چنانچہ اس کی مثالوں میں ہم وہ روایات پیش کر رہے ہیں کہ جس کو کلینی نے "درست واسطی" کے ذریعہ ابو عبداللہ سے نقل کیا ہے آپ نے فرمایا اصحاب کہف جیسا تقیہ کسی نے نہیں کیا۔ اگرچہ وہ ان کی عیدوں میں شریک ہوتے تھے اور "زنار" بھی باندھتے تھے مگر خدا نے ان کو دوہرا اجر کرامت فرمایا[1]

دوسری وجہ:

یہ ہے کہ شیعہ علماء کی اکثریت اور بعض خواص اپنے کو مسلمانوں سے الگ کر لینے ہی میں عافیت سمجھتے تھے۔ اس لئے کہ اگر وہ اپنے عقیدے کا اظہار کرتے تھے تو اس سے خوف و خطر جان کا خطرہ ہوتا تھا بلکہ دشمنی و بغض میں بھی اضافہ ہوتا تھا اور اگر وہ اس کو چھپانے پر مجبور ہوتے تھے تو وہ خود کو حق کے سامنے قصور وار سمجھتے تھے اور اپنے آپ کو جھوٹ کا مرتکب خیال کرتے تھے۔ لہٰذا وہ سنی مسلمانوں کے ساتھ ترک معاشرت ہی کو ترجیح دیتے تھے جبکہ وہ اس ترک معاشرت کے نقصانات سے قطعی طور پر غافل تھے کہ اس سے خشونت و بے ادبی میں اضافہ ہوتا ہے اور عواطف انسانیہ کو ٹھیس پہنچتی ہے ...... چنانچہ ...... ائمہ علیہم السلام نے ان کو سنیوں کے ساتھ معاشرت برقرار رکھنے کی تاکید کی تاکہ ان پر ترک معاشرت کا الزام نہ لگایا جائے اور وہ اپنے اماموں کے لئے بدنامی کا باعث نہ بنیں۔

۱۔ ج ۱۱۔ باب ۲۹۔ الامر بالمعروف۔

چاہے اس راہ میں ان کو تقیہ کا وسیلہ ہی کیوں نہ اختیار کرنا پڑے۔ جیسا کہ اس سلسلے کی مندرجہ ذیل روایتیں ہیں

اصول کافی میں کلینی نے ہشام کندی کی زبانی نقل کیا ہے۔ کہتے ہیں میں نے صادق آل محمد کو فرماتے ہوئے سنا.... خبردار! کوئی ایسا کام نہ کرنا جس کی وجہ سے لوگ ہم پر انگلی اٹھائیں اس لئے کہ بیٹے کی نالائقی کے سبب لوگ اس کے باپ پر انگلی اٹھاتے ہیں۔ اپنے گذشتگان کی نیک نامی کا باعث بنو ان کی بدنامی کا باعث نہ بنو۔ سُنیوں کے ساتھ نماز پڑھو۔ ان کے مریضوں کی عیادت کرو۔ ان کے جنازوں میں شرکت کرو........ یاد رکھو! وہ تم پر کسی امر خیر میں سبقت نہ لے جائیں۔ اس لئے کہ انجام خیر کے لئے ان کی بہ نسبت تم زیادہ بہتر ہو۔ خدا کی قسم تقیہ سے زیادہ بہتر کسی چیز کے ذریعہ بھی خدا کی عبادت نہیں کی گئی۔۱

یہ روایت بہ بانگ دہل اعلان کر رہی ہے کہ اہل سنت سے کنارہ کشی درست نہیں بلکہ ان کے ساتھ معاشرت لازم ہے۔ مثال کے طور پر ان کے ساتھ نمازوں، ان کے مریضوں کی عیادت، جنازوں میں شرکت اور اس کے علاوہ تمام امور میں ان کے ساتھ تعاون اور حسن معاشرت لازمی ہے۔ تاکہ وہ ترک معاشرت کے بہانے سے تمہارے ائمہ پر انگلی نہ اٹھا سکیں۔

۱۔ الکافی: عن هشام الکندی قال سمعت أبا عبد الله يقول: إياكم أن تعملوا عملاً نعيّر به فإن ولد السوء يعيّر والده بعمله، كونوا لمن انقطعتم إليه زيناً ولا تكونوا عليه شيناً، صلّوا في عشائرهم وعودوا مرضاهم واشهدوا جنائزهم ولا يسبقونكم إلى شيء من الخير فأنتم أولى به منهم، والله ما عبد الله بشيء أحب إليه من الخبء، قلت: وما الخبء؟ قال: التقية۔ ج ۲ ـ باب ۲۶ ـ ابواب امر بالمعروف۔

اور خود ان کی اور ان کے ماننے والوں کی اذیت کا سامان فراہم نہ کر سکیں۔ لہٰذا ان کے ساتھ حسن معاشرت کے سلسلہ میں تقیہ جائز ہے اور یہ تقیہ پسندیدہ ہے۔

اس روایت کو بھی کلینی نے مدرک ابن ہزہاز کے حوالے سے امام جعفر صادق سے نقل کیا ہے۔ آپ نے فرمایا خدا اس بندے پر رحم کرے جو عوام الناس کے ساتھ محبت کا برتاؤ رکھتا ہے۔ وہی کرتا ہے جس کو وہ پسند کرتے ہیں اور جس کو وہ ناپسند کرتے ہیں اس کو ترک کرتا ہے۔۱

اس میں کوئی شک نہیں کہ ان کے من پسند بات کرنا اور ناپسندیدہ باتوں کو ترک کرنا تقیہ کے محبوب ترین طریقوں میں سے ہے۔

تفسیر امام حسن عسکری علیہ السلام میں ہے کہ امام حسن نے فرمایا تقیہ کے ذریعہ خدا امت کی اصلاح فرماتا ہے۔ تقیہ کرنے والے کا ثواب امت کے اعمال کے ثواب کے برابر ہے مگر جو تقیہ ترک کرے اس نے گویا امت کو ہلاک کیا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ "تارک تقیہ امت کو ہلاک کرنے والے کا شریک ہوتا ہے۔۲"

اس روایت میں تقیہ کو امت کے حقوق کے ساتھ ذکر کرنے کا مطلب شاید یہ ہو کہ یہ دونوں امت کی وحدت اور اس کے مذہب کی حفاظت میں شریک ہیں۔ اگرچہ تقیہ میں تاکید خاص شیعوں کے لئے ہے اور حقوق امت کی تاکید عام سنیوں کے لئے ہے۔

اس کے علاوہ تفسیر نور الثقلین میں خداوند متعال کے اس قول "اجعل بيننا

۱۔ الکافی: عن مدرک بن الهزهاز عن أبي عبد الله قال: رحم الله عبداً اجترّ مودة الناس إلى نفسه فحدثهم بما يعرفون وترك ما ينكرون۔ ج ۲ ـ باب ۲۶ ـ ابواب امر بالمعروف۔

"وبینہم ردما"، اور "فما اسطاعوا ان یظہروہ وما استطاعوا لہ نقبا" کی
تفسیر میں بہت ساری روایات میں وارد ہوا ہے کہ اس سے مراد تقیہ ہے۔ اس لئے کہ تقیہ اور دشمنوں کے درمیان ایسی مضبوط دیوار ہے کہ جس کے ہوتے ہوئے دشمنوں کا کوئی وار کارگر نہیں ہو سکتا۔

اگرچہ آیت سے یہی مراد لینے کے لئے اس کے ظاہر سے عدول کر کے اس کی تاویل میں جانا پڑے گا تاکہ اس کے مناسب معنی پیدا کئے جائیں لیکن بہرحال روایت اس امر پر دلالت کرتی ہے کہ تقیہ دشمن کے لئے بہترین سد باب ہے۔ یہ صرف دشمن کی جانب سے پہنچنے والے نقصانات ہی کے دروازے بند نہیں کرتا بلکہ ہر قسم کی تہمت، ملامت وغیرہ کے سبب کے بھی اچھا چارہ گر اور ایسی دیوار ہے کہ دشمن نہ تو اس کو پھاند سکتا ہے اور نہ ہی اس میں نقب لگا سکتا ہے۔

علاوہ براین اس میں آئمہ معصومین علیہم السلام پر کچھ لوگوں کی طرف سے ہونے والے اعتراضات، جھوٹی افواہوں اور بغض و عناد کا بھی سد باب ہے۔ اس کے ہوتے ہوئے دشمن اپنے فاسد منصوبوں کو بروئے کار نہیں لا سکتا۔ اور نہ ہی ان مقدس ہستیوں کی ہتک حرمت کا مرتکب ہو سکتا ہے۔ چنانچہ "مجالس" میں مذکور امام علی ابن محمد سے ایک روایت اسی بات پر شاہد ہے فرماتے ہیں کہ امام صادق نے فرمایا: جو شخص تقیہ نہ کرے کمینے لوگوں سے ہم کو محفوظ نہیں رکھتا وہ ہم میں سے نہیں ہے۔[1]

۱۔ قال الصادق: "لیس منا من لم یلزم التقیۃ ویصوننا عن سفلۃ الرعیۃ"۔ ج ۲۷،
باب ۲۴، ابواب امر بالمعروف۔

۲۔ تقیہ کی غرض و غایت اور اس کی قسمیں

مذکورہ بیان سے روز روشن کی طرح عیاں ہو جاتا ہے کہ تقیہ کی غرض و غایت صرف نفوس مومنین کی حفاظت اور ان کو درپیش خطرات کا دفاع یا ان کے اموال و ناموس کی حفاظت ہی نہیں بلکہ مسلمانوں کی وحدت کی حفاظت اور ان کے درمیان رشتہ محبت برقرار کرنے اور ان کے دلوں کی کدورتوں کے بدل صاف کرنے کے لئے کبھی ایسے موارد میں تقیہ کیا جا سکتا ہے کہ جہاں عقیدے کے اظہار اور اس کے دفاع میں کوئی مصلحت اور اہم فائدہ موجود نہ ہو ...... اسی طرح تبلیغ رسالت کے فریضہ کو بطور احسن انجام دینے کے لئے بھی تقیہ کا استعمال مشروع ہے۔ جیسا کہ حضرت ابراہیم نے بت پرستوں کے مقابے میں کیا۔ اس کے علاوہ اگر کوئی مصلحت ہو تو اس کی خاطر بھی تقیہ جائز ہے۔ جیسا کہ حضرت یوسف نے اپنے بھائیوں کے سامنے تقیہ سے کام لیا۔

بنا برایں تقیہ کے وسیع مفہوم کو پیش نظر رکھتے ہوئے اس کی قسمیں درج ذیل ہو سکتی ہیں۔

۱۔ تقیہ خوفی۔
۲۔ تقیہ تحبیبی۔
۳۔ مختلف مصلحتوں کی خاطر تقیہ۔

"گذشتہ صفحات میں تینوں قسموں کی تشریح مثالوں کے ساتھ ہو چکی ہے۔" مترجم

الغرض مذہب تقیہ کی تمام قسمیں ایک وسیع مفہوم کے تحت جمع ہو سکتی ہیں۔ اور وہ مفہوم یہ ہے کہ انسان کسی اہم مصلحت کے تحت عقیدہ کو پوشیدہ رکھے اور اس کے خلاف اظہار کرے یعنی اہم کو بچانے اور مہم کو ترک کر دے جس کی تائید میں عقلی اور نقلی دلیلیں موجود ہیں۔ وہ اہم مصلحت چاہے دشمنوں سے اپنے نفوس، ناموس اور اموال کی حفاظت ہو چاہے مسلمانوں کے درمیان ایجاد محبت اور بغض و دشمنی کو دور کرنا ہو۔ یا ان کے علاوہ بے شمار دوسرے مصالح ہوں جن کا ذکر لازمی نہیں ہے۔

وجوب تقیہ کے موارد!

گذشتہ بیانات سے یہ بھی واضح ہو گیا کہ بہت سے موارد ایسے ہیں جہاں تقیہ واجب ہے۔ جب کہ کچھ موارد میں مستحب ہے۔ اس کا کلی قاعدہ یہ ہے کہ اگر وہ مصلحت جو تقیہ کا باعث بنتی ہے ایسی ہو جس کی حفاظت واجب اور جس کو نظر انداز کرنا حرام ہو تو تقیہ واجب ہو جاتا ہے۔ اور اگر فعل و ترک کے اعتبار سے وہ مصلحت مساوی ہو تو تقیہ مستحب ہے۔... بہر حال تقیہ مصلحت کے رجحان یا عدم رجحان کے تابع ہے۔ .... پس موارد وجوب کو مشخص کرنے اور بعض مصلحتوں کا دوسرے مصالح کے مقابلہ میں مرجح ہونے اور ان کی اہمیت کو درک کرنے کے لئے ذوق شرعی کے ساتھ ساتھ شرعی ضابطوں کی جانب رجوع کرنا بھی ضروری ہے۔ مثال کے طور پر جان کی حفاظت کے لئے اگر انسان کو پاؤں پر مسح ترک کر کے موزوں پر مسح کرنے پر اکتفا کرنا پڑے تو اس سلسلہ میں وہ روایات اس کی مددگار ہوں گی جن میں مشابہ تقیہ موجود نہیں ہے۔ اور اس کا مالک الحق عقب ہے۔ اور ترک تقیہ مثل ترک نماز ہے یا اس قسم کی دیگر تعبیرات جن سے وجوب تقیہ سمجھ میں آتا ہے اور وہ ایسی ضروری مصلحتوں کے

بارے میں ہیں جن کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ .... اسی طرح وہ روایات جو قول پروردگار "ادفع بالتی ھی احسن السیئۃ" کی تفسیر میں وارد ہوئی ہیں کہ اس سے مراد تقیہ ہے۔ ...... اور جب انسان تقیہ پر عمل کرے تو وہ دشمن کا سد باب کر کے اپنے لیے دوست بنا سکتا ہے۔ "فاذا الذی بینک و بینہ عداوۃ کانہ ولی حمیم" یہ وہ روایتیں ہیں جو تقیہ کے مستحب ہونے پر دلالت کرتی ہیں۔ ... حاصل اخبار تقیہ بے شمار ہیں اور ان کے لہجہ بیان میں حد درجہ اختلاف ہے۔ چنانچہ وہ مختلف موارد کے لئے ہیں اور ہر مورد پر ایک ہی حکم نہیں لگایا جا سکتا۔

ایک ضروری آگاہی!

مذکورہ مطالب کا گہری نظر سے مطالعہ کرنے کے بعد کسی شک کی گنجائش نہیں رہ جاتی کہ تقیہ صرف شیعوں ہی کے نزدیک واجب نہیں اور صرف شیعوں کی روایات اور ان کے ائمہ علیہم السلام کے اقوال ہی اس کے جواز یا وجوب پر دلالت نہیں کرتے بلکہ قرآنی آیات، اجماع قاطع، احادیث متواترہ کے علاوہ عقل سلیم بھی اس کے جائز ہونے کی گواہ ہیں۔

اس کے علاوہ یہ امر بھی مسلم ہے کہ تقیہ کسی قوم و ملت یا دین و مذہب سے مخصوص نہیں بلکہ ہر قوم ملت و مذہب کے ماننے والے اس سے استفادہ کرتے ہیں اور ضرورت کے وقت سے اپنی سپر بناتے ہیں۔ ...... کیا کسی صاحب عقل کو آپ نے دیکھا ہے کہ وہ ایسے موارد میں اظہار عقیدہ کرتا ہو جن میں فائدہ کم اور نقصان زیادہ ہو یا بالکل فائدہ نہ ہو؟ نقصان سے بچنے کے لئے اور اپنی جان و مال کی حفاظت کے لئے ہر صاحب عقل تقیہ سے استفادہ کرتے ہوئے ایسے موقع پر اظہار عقیدہ سے باز رہتا ہے۔ ...... بلکہ

انصاف کی بات تو یہ ہے کہ جو لوگ سرے سے تقیہ کو حرام قرار دیتے ہیں اور اس میں کسی استثنا کے روادار نہیں ہیں وہ بھی صرف زبانی حد تک ایسا کرتے ہیں۔ اگر آپ ان کی عملی زندگی کا مشاہدہ کریں تو تقیہ سے پر نظر آئے گی۔ ان کے زبانی دعوے صرف نعروں کی رونق برقرار رکھنے کیلئے ہیں۔ ورنہ عمل میدان میں ایسے موارد میں تقیہ پر عمل کرنے کے سلسلہ میں کہ جن میں اظہار عقیدہ بے فائدہ اور باعث ضرر ہو محمود و ایاز ایک ہی صف میں کھڑے نظر آتے ہیں۔ اس لئے کہ یہ حکم عقل ہے اور کوئی بھی صاحب عقل اس سے سرپیچی نہیں کر سکتا۔ یہ اور بات ہے کہ وہ اپنے اس عمل کو تقیہ نہ کہتا ہو۔

تقیہ کے موارد وجوب کی طرف اشارہ کرنے کے بعد ہم پیشگی عرض کر دیں کہ عنقریب ہم ایسے موارد بھی بیان کریں گے جن میں نہ صرف تقیہ حرام ہے بلکہ ان میں جان و مال کی قربانی واجب ہے اور ان مواقع پر تقیہ کی مخالفت نہ فقط پسندیدہ ہے بلکہ موجب فضیلت ہے۔

اگر زمانے سے باخبر کوئی مجتہد یا فقیہ حالات کے پیش نظر احکام الٰہی کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لئے کسی خاص زمانہ میں تقیہ کی حرمت کا فتویٰ صادر کرتے ہوئے اس بات کا اعلان کر دے کہ اب مدارات کی گنجائش نہیں بلکہ دشمن کے مقابلہ میں جان و مال کے ذریعہ جہاد واجب ہے تو اس کا مطلب ہرگز یہ نہیں ہو سکتا کہ تقیہ ہمیشہ حرام ہے۔

موارد حرمت تقیہ

بحث کے آغاز میں ہم عرض کر چکے ہیں کہ بلند پایہ محققین اور عظیم فقہاء نے تقیہ کو پانچ قسموں میں تقسیم کیا ہے۔ اور بطور اجمال ہم نے ان مواقع کی طرف اشارہ کیا ہے جن میں تقیہ واجب، مستحب اور جائز ہوتا ہے۔ اب ذیل میں ان مواقع کا ذکر ہے جن میں تقیہ حرام ہے۔

۱۔ اگر دین میں فساد کا خطرہ ہو تو تقیہ جائز نہیں ہے

اگر تقیہ کی وجہ سے دین میں فساد اور ارکان اسلام میں تزلزل پیدا ہو، شعائر الٰہی محو ہو رہے ہوں اور کفر کو طاقت مل رہی ہو یا کوئی ایسا مسئلہ درپیش ہو کہ شارع کی نظر میں جس کی حفاظت جان و مال سے زیادہ ضروری ہو تو ایسے ہر موقع پر بلاشبہ تقیہ حرام ہے۔

اور اس کا ترک کر دینا واجب ہے۔ لیکن ان موارد کی تشخیص عام آدمی کے بس کا روگ نہیں بلکہ فقہا و مجتہدین کا کام ہے۔ اس لئے کہ ان موارد کو درک کرنے کے لئے ادلۂ شرعیہ پر تسلط، عمدہ ذوق شریعت اور مصالح فکر کی بہت زیادہ ضرورت ہے ...... قاعدۂ اہم و مہم کے علاوہ چند روایات بھی اس مطلب پر دلالت کرتی ہیں جن کو ہم ذیل میں نقل کرتے ہیں۔

ا۔ کافی میں کلینی نے مسعدۃ ابن صدقہ کے حوالے سے امام جعفر صادق سے نقل کیا ہے کہ اگر مومن اظہار ایمان کے بعد کوئی ایسا عمل انجام دے جس سے ایمان کی نفی ہوتی ہو تو وہ مومنوں کی صف سے خارج ہو جاتا ہے لیکن اگر وہ ادعا کرے کہ اس نے جو عمل انجام دیا ہے وہ تقیہ کی بنا پر تھا تو دیکھنا یہ ہوگا کہ آیا اس مورد میں تقیہ جائز تھا یا نہیں؟ اگر جائز نہیں تھا تو اس کا عذر ناقابل قبول ہے۔ اس لئے کہ تقیہ کے حدود معین ہیں جن کی خلاف ورزی کرنے والا معاف نہیں ہے۔ "ما یتقی" کا مطلب یہ ہے کہ وہ شخص ایسی قوم میں پھنسا ہوا ہو جو ظالم بھی ہوں اور اس پر غلبہ بھی رکھتے ہوں۔ اس صورت میں مومن کا ہر وہ عمل جو تقیہ کی بنا پر ہو اور دین میں فساد کا باعث نہ بنے جائز شمار ہوگا۔

ا۔ ج ۲ ۔ ۹۶ ۔ باب ۲۵ ۔ الامر بالمعروف۔

اس کا مطلب یہ ہوا کہ اگر تقیہ کی وجہ سے دین میں فساد کا اندیشہ ہو تو تقیہ جائز نہیں ہے۔

۲۔ اس روایت کو کشی نے اپنی "رجال" میں درست ابن ابی منصور سے نقل کیا ہے۔ کہتے ہیں میں امام کاظم کی خدمت میں حاضر تھا اور "کمیت ابن زید" بھی وہاں موجود تھا ...... امام نے "کمیت" پر اعتراض کرتے ہوئے بعنوان سرزنش فرمایا، کیا یہ شعر تم نے کہا ہے۔ ؟ "اب میں بنی امیہ کے ساتھ ہوں اور ان کے امور کی برگشت میری جانب

ہے۔" کمیت نے عرض کی "ہاں" میں نے ہی کہا ہے۔ لیکن میں اپنے ایمان سے منحرف نہیں ہوا ہوں۔ میں آپ کا خادم ہوں اور آپ کے دشمنوں سے نفرت کرتا ہوں، البتہ میں نے یہ شعر تقیہ کرتے ہوئے کہا ہے ...... تب امام نے فرمایا اگر ایسے ہی تقیہ ہونے لگے تو پھر شراب میں بھی تقیہ جائز ہو جائے گا ...... اس کا مطلب یہ ہے کہ امام ہر مورد میں تقیہ جائز نہیں جانتے۔ اسی لئے آپ نے کمیت پر اس کے اس شعر کی بنا پر اعتراض کیا جس سے بنی امیہ کی مدح ہوتی تھی۔ اور جو اس بات کی علامت بن گیا کہ کمیت ایک مشہور و معروف محب اہل بیت کہلانے کے بعد بنی امیہ کے طرفدار ہو گئے ...... جبکہ "کمیت" جیسا آدمی جب عذر پیش کرتا ہے کہ اس کا یہ شعر صرف زبانی اور ظاہر پر مبنی تھا تو امام اس کے عذر کو رد کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ اگر تقیہ کا میدان اس قدر وسیع ہوتا تو ہر چیز میں حتی شراب پینے میں بھی تقیہ جائز ہوتا حالانکہ ایسا نہیں ہے ......

امام موسیٰ کاظم علیہ السلام کا کمیت پر اعتراض اور سرزنش اس امر کی دلیل ہے کہ بنی امیہ جیسے ظالموں کی تعریف زبان سے اظہار محبت جیسے امور میں تقیہ جائز نہیں ہے۔ اس لئے کہ اس طرح کے افراد کبھی کبھی کفر کی بنیادوں کو مضبوط، اور گمراہی اور جہالت کی تائید و طرفداری کا موجب بنتے ہیں۔ جس سے دین کو نقصان پہنچتا ہے۔ لہٰذا ایسے مواقع پر تقیہ ناجائز ہے ...... جب اس ایک بیت کی حد تک تقیہ جائز نہ ہوا تو ظاہر ہے پھر اس قسم کی ایسی باتیں کرنے میں جن سے کفر و ضلال کو قوت پہنچتی ہو اور ہدایت مخفی ہو جاتی ہو حق باطل کے ساتھ مشتبہ ہو کر بہت سے لوگوں سے مخفی ہو جاتا ہو تقیہ کب جائز ہوگا۔ خاص

ا۔ فالآن صرت الی امیۃ والامور لها الی مصائر

طور سے ان لوگوں کے لئے جن کے اقوال بطور سند پیش کئے جاتے ہوں اور جن کا فعل نمونہ عمل ہو ایسے موارد میں تقیہ حرام ہے۔ البتہ ان موارد کی تشخیص جیسا کہ عرض ہو چکا ہے عرف فقیہ کے بس کی بات ہے ہر آدمی کا کام نہیں۔

طبرسی نے احتجاج میں امام حسن عسکری علیہ السلام کی زبانی امام رضا کی ایک حدیث نقل کی ہے جس میں اگرچہ واضح طور پر ترک تقیہ کا باعث فساد دین کو قرار نہیں دیا گیا ہے لیکن در اصل باعث وہی ہے۔ اس لئے کہ اس سے زیادہ اہم کوئی امر نہیں تھا جس کی وجہ سے ترک تقیہ ضروری ہوتا...... البتہ حال یہ ہے کہ وہ لوگ بغیر کسی خطرے کے تقیہ کرتے ہوں اور جہاں خطرہ ہو وہاں نہ کرتے ہوں تو امام نے ان کو اس سے روکا ہو۔

ابو حمزہ ثمالی ناقل ہیں کہ حضرت ابو عبداللہ علیہ السلام نے فرمایا: خدا کی قسم اگر تمہیں ہم اہل بیت کے لئے آواز دیں تو تم صاف انکار کر دو گے اور بہانہ بناؤ گے کہ ہم تقیہ میں ہیں... آیا تقیہ تمہیں ماں باپ سے بھی زیادہ عزیز ہے...... اسی حالت میں اگر قائم کا ظہور ہو گیا تو تم سے معلوم کئے بغیر تم میں سے بہت سوں پر حد نفاق جاری کریں گے۔[2]

یہ روایت واضح طور پر کہہ رہی ہے کہ اگر دین خطرے میں ہو اور امام نصرت کے لئے پکاریں تو ترک تقیہ لازم ہے۔ اس لئے کہ جو شخص اس موقع پر تقیہ کرے گا قائم آل محمد اس پر حد جاری کریں گے جس کا مطلب یہ ہے کہ ایسے موقع پر تقیہ سخت حرام ہے۔

بہر حال تقیہ دین کے لئے ہے۔ چنانچہ اگر دین خطرے میں ہو اور اس کے وہ احکام

۱۔ ج ۱۔ باب ۲۵۔ الامر بالمعروف۔

۲۔ ج ۲۔ باب ۳۱۔ ......

احکام جن کی بقا و ترویج کے لئے پہلے ہجرت کرنے والوں اور انصار نے اپنی جانوں کے نذرانے پیش کئے ہیں اور اپنا خون دے کر اس کو بچایا ہے، مٹ جانے کا اندیشہ ہو تو کسی قیمت پر بھی تقیہ جائز نہیں ہے۔

۲۔ قتل میں تقیہ جائز نہیں ہے۔

اگر تقیہ کی بنا پر کسی کو قتل کرنا پڑے مثال کے طور پر کوئی کافر یا فاسق کسی مومن کو قتل کر دینے کا حکم دے اور شخص مجبور جانتا ہو کہ اگر میں مومن کو قتل نہیں کروں گا تو خود قتل ہو جاؤں گا ایسے موقع پر تقیہ جائز نہیں ہے اس لئے کہ مومن کا خون محترم ہے۔ لہٰذا اپنی جان کی حفاظت کی خاطر دوسرے مومن کو قتل نہیں کیا جا سکتا۔ اس لئے کہ مومنوں کے نفوس مساوی ہیں۔ تقیہ خونریزی اور جان گنوانے سے بچنے کے لئے ہے لیکن اگر نوبت خونریزی تک پہنچ جائے تو تقیہ کوئی معنی نہیں رکھتا اور ایسی صورت میں تقیہ کا حکم حکمت حکیم کے منافی ہے۔ .... چنانچہ اس بارے میں کئی احادیث نقل کی جاتی ہیں۔

۱۔ ان روایات میں سے ایک روایت کو محمد ابن یعقوب کلینیؒ نے کافی میں محمد ابن مسلم کے حوالے سے امام محمد باقرؑ سے نقل کیا ہے۔ آپ نے فرمایا: تقیہ جان کی حفاظت کے لئے رکھا گیا ہے۔ لیکن جب اس سے کسی کی جان جاتی ہو تو ہرگز جائز نہیں ہے[1]

۱۔ محمد بن یعقوب الکلینی عن محمد بن مسلم عن ابی جعفر الباقر ع قال انما جعل التقیہ [illegible]

۲۔ دوسری روایت کو شیخ "تہذیب" میں ابو حمزہ ثمالی کے حوالے سے امام جعفر صادقؑ سے نقل کرتے ہیں۔ آپ نے فرمایا کہ زمین خدا پر ہمیشہ اور ہر دور میں ایسا عالم موجود رہتا ہے جو حق و باطل میں تمیز کر سکے ..... تقیہ حفظ نفس کے لئے ہے۔ اگر خون ہی جو اس کے ذریعہ خطرے میں پڑ جائیں تو تقیہ بے معنی ہو جائے گا۔[1]

۳۔ شراب خوری یا اس طرح کے محرمات میں تقیہ حرام ہے

روایات میں وارد ہے کہ بعض اہم امور جیسے شراب خوری یا نبیذ خوری، موزوں پر مسح، متعہ حج وغیرہ میں تقیہ حرام ہے۔ چنانچہ ہم پہلے روایت کو ذکر کر دیں تب اس کا سبب بیان کریں گے۔

۱۔ امام جعفر صادقؑ سے ابن اعجمی نے نقل کیا ہے آپ نے فرمایا۔ نبیذ اور موزوں پر مسح کے علاوہ ہر چیز میں تقیہ جائز ہے۔[2]

[illegible] ، بحث ... ج ۲، باب ۳۰ [illegible]

۱۔ عن ابی حمزة الثمالی قال قال ابو عبدالله ... لم تخل الارض الا وفيها عالم يعرف الحق من الباطل ... انما جعلت التقية ليحقن بها الدم فاذا بلغ الدم فلا تقية ج ۲ باب ۳۰ [illegible]

۲۔ عن ابی عبدالله ... في حديث قال والتقية في كل شيء الا في النبيذ والمسح على الخفين۔ ج ۲ ، باب ۲۵ ، [illegible]

۳۔ کافی میں زرارہ سے منقول ہے کہ میں نے امام کی خدمت میں عرض کیا کیا موزوں پر مسح کرنے میں تقیہ ہے؟ آپ نے فرمایا "تین چیزیں ایسی ہیں جن میں سے کسی میں بھی میں تقیہ نہیں کرتا۔ نشہ آور چیز کا استعمال، موزوں پر مسح اور متعہ حج۔" زرارہ کہتے ہیں، امام نے نہیں فرمایا تم پر واجب ہے کہ ان میں سے کسی چیز میں بھی تقیہ نہ کرو۔[1]

ان امور میں تقیہ حرام ہونے کی وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ ان میں تقیہ بے جا ہے۔ اس لئے کہ تقیہ خوف و خطرے کے مواقع میں نفوس کی حفاظت کے لئے رکھا گیا ہے اور اس میں کوئی وہ ملنے نہیں کہ جان کا خطرہ ایسے امور کے اظہار کے نتیجے میں ہو سکتا ہے جن کو وضاحت کے ساتھ قرآن میں نہیں بیان کیا گیا ہے۔ اگر قرآن یا سنت میں امر کا موجود ہو تو چاہے وہ عمل کسی بھی قوم کی سیرت کے منافی ہو تب بھی اس میں تقیہ نہیں ہے ...... مثلاً شراب خوری اور نبیذ جیسے امور کی حرمت صراحت کے ساتھ قرآن میں موجود ہے.......

ایسے ہی متعہ حج کے لئے بھی قرآن میں ارشاد ہوتا ہے۔ فمن تمتع بالعمرة الى الحج فما استيسر من الهدي ..... ذلك لمن لم يكن اهله حاضري المسجد الحرام[2] یہ آیت وجوب یا کم سے کم جواز تقیہ کے لئے بہترین دلیل ہے۔ اور سنت نبوی میں بھی اس کا حکم موجود ہے جس کو فریقین نے اپنی کتابوں میں ذکر کیا ہے بلکہ جناب عمر نے خاص طور سے اعلان کیا ہے۔ "دو متعہ پیغمبر کے زمانہ میں حلال تھے اور میں ان کو حرام قرار دیتا ہوں۔" یہ اعلان متعہ حج کے جائز قرار دیئے جانے کی بہترین دلیل ہے۔ چنانچہ ترک تقیہ کے لئے اتنا کافی ہے کہ انسان کے پاس قرآن یا سنت سے

البقرہ آیت ۱۹۶۔

بہترین دلیل موجود ہو۔

اسی طرح موزوں پر مسح ترک کرکے صرف پاؤں پر مسح کرنے پر اکتفا کرنے کے بارے میں بھی قرآن میں صراحت موجود ہے۔ "وامسحوا برؤسکم وارجلکم الی الکعبین"[1] روز روشن کی طرح عیاں ہے کہ پاؤں یا سر پر مسح اسی وقت کیا جائے گا جب موزے یا عمامہ پر مسح ترک کرکے خود پاؤں یا سر پر مسح کیا جائے۔ اور ہر شخص اسلامی دنیا میں ایسا کر سکتا ہے اور اگر کوئی شخص اس مورد میں بھی خوف کی بنا پر تقیہ کرنے پر مجبور ہو تو یہ تقیہ حکمی کہلائے گا۔

لیکن اگر جہالت اور تعصب معاشرے پر غالب ہو اور ان امور کے اظہار میں جان کا خطرہ ہو تو انسان تقیہ کرتے ہوئے ان امور کا ارتکاب کر سکتا ہے۔ اس لئے کہ تمام اسلامی احکام واجبہ سے ان امور کی اہمیت زیادہ نہیں ہے۔ جب اظہار کفر میں تقیہ ہو سکتا ہے تو پھر شراب خوری اور موزوں پر مسح جیسے فرعی امور میں بدرجہ اولیٰ بے اشکال ہے........

........اور انصاف کی بات تو یہ ہے کہ مذکورہ روایت بھی اس کی مخالف نہیں بلکہ روایات کی نظر اس نکتہ پہ ہے کہ اس قسم کے امور میں جن کو قرآن نے وضاحت کے ساتھ بیان کر دیا ہو اور سنت قطعی بھی اس کی تائید کر رہی ہو تو تقیہ کی حاجت پیش نہیں آتی لیکن اگر کسی بعض حالات میں جان و مال خطرے میں ہوں چاہے تعصب کی بنا پر یا جہالت کے سبب سے تو اس وقت ان امور میں بھی تقیہ جائز ہے۔ مثال کے طور پر اگر حاکم ظالم کے نزدیک موزوں پر مسح لازمی ہو یا وہ متعہ حج کو حرام جانتا ہو اور اس کا اعتقاد نہ رکھنے والے کو قتل کر دیتا ہو تو کیا ایسی

۱۔ المائدہ، آیت ۶۔

حالت میں بھی تقیہ ترک کر دیا جائے اور موت کو گلے لگایا جائے؟ ہرگز ایسا نہیں کیا جا سکتا اور میرے خیال میں کسی کا یہ نظریہ بھی نہیں ہے۔ اسی طرح قتل کے علاوہ وہ نقصانات جو شارع کی نظر میں ان امور سے زیادہ اہم ہیں تقیہ کو چھوڑ کر ان کا متحمل ہونا ہرگز واجب نہیں ہے۔

اس بیان سے روشن ہو جاتا ہے کہ زرارہ نے جو استدلال کرکے مذکورہ موارد میں عدم تقیہ کو امام سے مخصوص کرنے کی سعی کی ہے وہ بے فائدہ ہے۔ اس لئے کہ قرآن و حدیث سے ان امور کا حکم واضح ہو جانے کے بعد حکم عام ہو جاتا ہے اور انسان ان میں تقیہ کرنے پر مجبور نہیں ہوتا۔ لہذا اگرچہ "زرارہ" کا شمار فقہائے اہل بیت میں ہوتا ہے۔ لیکن وہ گویا ہیں "شہسواری میدان جنگ میں" اور عصمت اہل عصمت علیہم السلام کا خاصہ ہے۔ لہذا ہم یہ عرض کر سکتے ہیں کہ "زرارہ" کا استنباط بے محل ہے۔

ہمارے اس قول کی دلیل وہ روایت ہے جس کو صدوق نے "الخصال" میں حضرت علی علیہ السلام سے بیان کیا ہے۔ آپ نے ارشاد فرمایا کہ "شراب خوری اور موزوں پر مسح کرنے میں تقیہ نہیں ہے۔"[1] ظاہر حدیث یہ ہے کہ ان میں سے کسی میں بھی تقیہ جائز نہیں ہے۔

اور اسی مضمون کی ایک روایت امام جعفر صادق علیہ السلام سے ابی عمر الاعجمی کے ذریعہ نقل ہو چکی ہے۔ جس میں آپ نے فرمایا "ہر چیز میں تقیہ ہے مگر (نبیذ) اور موزوں پر مسح کرنے میں تقیہ نہیں ہے۔"[2] یعنی تقیہ کی بنا پر نہ نبیذ استعمال کر سکتے ہیں اور نہ موزوں پر مسح کر سکتے ہیں۔ البتہ ان امور میں تقیہ کے جواز پر ہماری بات کی اس روایت سے تائید ہوتی ہے جس کو

۱۔ عن علی علیہ السلام فی حدیث الاربعمائة قال لیس فی شرب مسکر ومسح خف...

۲۔ المصدر نفسہ۔ ج ۱۸۔ باب ۳۹۔ الحدیث الاخیر

شیخ نے اپنی تہذیب میں ابی الورد کے حوالے سے لکھا ہے کہ جب ہم نے امام محمد باقر علیہ السلام کی خدمت میں عرض کی کہ ابو ظبیان نے مجھ سے کہا کہ میں (ابو ظبیان) نے علیؑ کو دیکھا کہ انھوں نے پانی بہایا اور موزوں پر مسح کیا تو امام محمد باقرؑ نے فرمایا کہ ابو ظبیان نے جھوٹ بولا۔ کیا تم نے علیؑ کا یہ قول نہیں سنا کہ قرآن میں تمہارے سے خفین کے بارے میں حکم بیان ہو چکا ہے۔ میں نے عرض کی کیا ان میں رخصت ہے۔ تو آپ نے فرمایا نہیں، مگر یہ کہ دشمن کے خوف کی بنا پر یا پاؤں کو برف سے بچانے کے لئے موزوں پر مسح کرنے کی اجازت ہے۔[1]

اس حدیث میں بھی اس امر کی جانب اشارہ ہے کہ قرآن کی سورۂ مائدہ میں پاؤں پر مسح کرنے کا حکم صراحت کے ساتھ بیان ہو جانے کے بعد موزوں پر مسح کرنا کسی کے لئے بھی جائز نہیں ہے۔

۴۔ ضرورت کے بغیر تقیہ جائز نہیں ہے۔

معصومین علیہم السلام کی اکثر روایات میں صراحت کے ساتھ موجود ہے کہ بغیر ضرورت تقیہ جائز نہیں ہے۔ اس لئے کہ اس کی ضرورت خوف ہے، اور ضرورت نہ ہونے کا مطلب یہ ہے کہ خوف ختم ہو چکا ہے، اور تقیہ خوف کی بنا پر ہو سکتا ہے لہذا جب خوف نہ ہو تو تقیہ کا موضوع ہی باقی نہیں رہتا جیسا کہ اول بحث میں ہم عرض کر چکے ہیں۔ چنانچہ

۱۔ ج ۵۔ باب ۳۸۔ ابواب الوضوء۔

اس سلسلہ کی روایات پیش خدمت ہیں۔

۱۔ کلینی نے "زرارہ" سے اور انھوں نے امام محمد باقر علیہ السلام سے روایت نقل کی ہے: "آپ نے فرمایا، تقیہ ضرورت کے وقت ہوتا ہے جس کا علم صاحب ضرورت کو ہو جاتا ہے"۔[1]

۲۔ اصول کافی میں ہی امام باقر علیہ السلام سے منقول ہے آپ نے فرمایا: کسی چیز میں انسان کی مجبوری کے وقت تقیہ کو خدا نے اس کے لئے حلال قرار دیا ہے۔[2]

۳۔ محاسن میں امام پنجم سے مروی ہے کہ: ہر ضرورت میں تقیہ ہے۔[3]

تذکر:

یہ تینوں روایتیں مختلف اور متعدد طریقوں سے نقل ہوئی ہیں، جس کا مطلب یہ ہے کہ ضرورت اور اضطرار کے وقت تقیہ کے جواز کے سلسلہ میں ان پر اعتماد کیا جا سکتا ہے، اگرچہ دلائل عقلیہ اور اور فطرت بشری کے تقاضوں کی موجودگی میں جواز تقیہ پر استدلال کے لئے ہمیں ان کی زیادہ ضرورت نہیں ہے لیکن پھر بھی بعض مشکلات ایسی پیش آتی ہیں جن میں تقیہ کے جواز پر دلالت کے لئے ان روایات کی اشد ضرورت ہے۔

۱۔ ج ۲، باب ۷۵ اصول، مرآۃ معروف
۲۔ ج ۲ " " " " " " "
۳۔ ج ۸ " " " " " " " "

اختیارِ کفر

اور

ایمان سے برأت میں تقیہ کا حکم

اگر جان کا خطرہ لاحق ہو تو دل میں ایمان کو محفوظ رکھتے ہوئے زبانی طور پر ایمان سے اظہارِ بیزاری اور کلمۂ کفر بکنے پر نص اور فتویٰ دونوں متفق ہیں۔ ۔ ۔ ۔ لیکن اختلاف اس امر میں ہے کہ آیا ایسے موقع پر تقیہ سے دست بردار ہو کر جس سے بڑا نقصان برداشت کر لینا بہتر ہے یا تقیہ کر کے خطرے کو ٹال دینا زیادہ بہتر ہے۔ یہاں ظاہراً روایات اور فتوے دونوں اس مسئلہ میں مختلف ہیں۔ لیکن آگے چل کے جب ہم اس بحث میں غور و خوض سے کام لیں گے اس وقت یہ بات روشن ہو جائے گی کہ ان میں اختلاف نہیں بلکہ رجال، شرائط اور ظروفِ تقیہ کے اعتبار سے فرق ہے۔

ہماری بحث کی ترتیب یہ ہے کہ پہلے ہم اس کے بارے میں گفتگو کرتے ہوئے

اس کی دلیلیں ذکر کریں گے اور اس کے بعد عرض کریں گے کہ ان میں سے کون بہتر ہے اور کون نہیں۔ اور یہ بھی دیکھیں گے کہ علماء اہلبیت کا طرز کیا ہے کہ جنھوں نے جان و دل سے دین کی حمایت اور نصرت کا فریضہ انجام دیا ہے۔ اور ہمیشہ اس اطاعت سے متمسک رہے ہیں اور کبھی بھی کلمۂ کفر کو زبان تک نہیں لائے۔

بہرحال کثیر تعداد میں احادیث اظہارِ کلمۂ کفر کے جواز پر دلالت کرتی ہیں جن میں سے چند حدیثیں بطورِ نمونہ ذیل میں درج کی جاتی ہیں۔

۱۔ تقیہ کے جواز پر دلالت کرنے والی آیات کے ذیل میں ایک روایت منقول ہے جو پروردگار کے اس قول « الا من اکرہ وقلبہ مطمئن بالایمان » کی تفسیر کرتی ہے یہ آیت حضرت عمار کے بارے میں ہے۔ جس کو فریقین نے نقل کیا ہے۔ تفصیل یوں ہے کہ حضرت عمار کو جب مجبور کیا گیا تو وہ کلمۂ کفر کا اظہار کر بیٹھے لیکن ان کے والدین نے شہادت کو گلے لگایا۔ بعدہٗ سرکارِ رسالت کی خدمت میں روتے ہوئے حاضر ہوئے۔ اسی درمیان کچھ اصحاب نے کہا عمار کافر ہو گئے لیکن رحمتِ دو عالم نے آگے بڑھ کر عمار کے آنسو پونچھے اور فرمایا اگر کفار پھر مجبور کریں تو پھر وہی کہنا جو کہہ چکے ہو۔ اس سلسلے کی آیت نازل ہو چکی ہے۔ "کہ جس کو مجبور کیا جائے اظہارِ کفر پر حالانکہ اس کا دل ایمان سے معمور ہو" یہ روایت بالصراحت تقیہ اور اظہارِ کلمۂ کفر کے جواز پر دلالت کرتی ہے۔

۲۔ اس روایت کو بھی فریقین نے نقل کیا ہے اور آیت کے ذیل میں اس کی تفصیل گزر چکی ہے۔ مسیلمۂ کذاب نے پیغمبرؐ کے دو صحابیوں کو بجبر اپنی نبوت کی شہادت دینے پر مجبور کیا ایک نے شہادت دے دی مگر دوسرے نے انکار کر دیا اور شہید ہو گیا۔ تو حضورؐ نے فرمایا کہ پہلے نے خدا کی دی ہوئی چھوٹ سے استفادہ کیا لیکن دوسرے نے حق کا اظہار بیانگ دہل کیا

اور شہادت اس کو مبارک ہو۔" اگرچہ اس روایت میں جبر کر کے اظہار بیزاری کا ذکر نہیں ہے لیکن مسیلمہ کی رسالت کی گواہی کلمۂ کفر ہے۔ جب یہ جائز ہے تو وہ بھی جائز ہے۔

۳۔ ان دونوں روایتوں کے ہم معنی ایک روایت کو اصول کافی میں کلینی نے عبداللہ ابن عطاء کے حوالے سے نقل کیا ہے۔ کہتے ہیں میں نے امام محمد باقرؑ کی خدمت میں عرض کیا کہ کوفہ کے دو اشخاص پکڑے گئے اور ان سے کہا گیا کہ امیرالمومنینؑ سے بیزاری کا اظہار کریں ان میں سے ایک نے قبول کر لیا اور دوسرے نے انکار کر دیا چنانچہ پہلے کو چھوڑ دیا گیا اور جس نے انکار کیا اسے قتل کر دیا گیا .... تو امیرالمومنینؑ نے فرمایا جس نے بیزاری کا اظہار کیا وہ فقیہ ہے لیکن جس نے انکار کر دیا اس نے جنت حاصل کرنے میں جلدی کی۔[1]

اس روایت کی دلالت کے بارے میں ہم عرض کریں گے کہ اس کا رجحان فعل تقیہ کی جانب ہے یا ترک تقیہ کی طرف۔

۴۔ کلینی مسعدۃ ابن صدقہ سے ناقل ہیں۔ ابن صدقہ نے بیان کیا کہ میں نے امام جعفر صادقؑ سے عرض کی لوگ کہتے ہیں امیرالمومنین علیؑ نے منبر کوفہ سے اپنے خطبے میں اعلان فرمایا "اے لوگو! عنقریب تم کو مجھ پر سب و شتم کرنے پر مجبور کیا جائے گا تو اس وقت تم مجھ پر سب و شتم کر سکتے ہو۔ پھر تمہیں مجھ سے اظہار برائت کے لئے کہا جائے گا مگر مجھ سے اظہار برائت نہ کرنا۔" .... بس پھر امام جعفر صادقؑ نے فرمایا "لوگ علیؑ کے بارے میں کس قدر جھوٹ بولتے ہیں۔" حالانکہ آنحضرتؑ نے یوں فرمایا تھا۔ "اگر تمہیں مجھ پر سب و شتم کرنے کے لئے کہا جائے گا تو کر دینا۔ پھر اظہار برائت کے لئے کہا جائے گا تو یاد رکھو میں

محمدؐ کے دین پر ہوں۔ آپ نے یہ نہیں فرمایا کہ مجھ سے اظہار برائت نہ کرنا۔ جب بات یہاں تک پہنچی تو سائل نے عرض کی "کیا آپ یہ فرماتے ہیں کہ میں اظہار برائت کے بجائے قتل ہو جانا اختیار کروں؟" آپ نے فرمایا "حضرت کی مراد یہ نہیں۔" اس سے مراد وہی طریقہ ہے جو عمار ابن یاسر نے اس وقت اختیار کیا جب کفار مکہ نے ان کو مجبور کیا۔ جب کہ ان کا دل ایمان سے مطمئن تھا جس پر پروردگار نے یہ آیت نازل فرمائی "مگر وہ شخص جس کو مجبور کیا جائے حالانکہ اس کا دل ایمان سے مطمئن ہو۔" تو پیغمبر اسلامؐ نے فرمایا: اے عمار! اگر وہ لوگ دوبارہ مجبور کریں تو تم پھر وہی کرو۔ خدا نے تمہارے عذر سے مجھے آگاہ کر دیا ہے۔[1]

اگرچہ اس روایت سے بھی تقیہ کا وجوب ظاہر ہوتا ہے۔ لیکن غور کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ روایت میں صرف حرمت تقیہ کی نفی مقصود ہے۔ خاص طور سے علیؑ اور اولاد و آلؑ علیہم السلام سے اظہار برائت کے سلسلہ میں کہ بعض جن کی ہتک حرمت بلکہ ان کو گالی دینا بھی لوگ جائز سمجھتے تھے۔

اس کے علاوہ حضرت کا یہ فرمانا کہ "[illegible]" یعنی امیرالمومنینؑ کہ یہ نہیں۔" اور اس کے بعد قصہ حضرت عمار بیان کرنا اس بات کی دلیل ہے کہ روایت وجوب تقیہ کو ثابت نہیں کرتی بلکہ حرمت تقیہ کی نفی کرتی ہے۔ اسی لئے حضرت عمار کے والدین کا فعل بھی جائز تھا۔ جیسا کہ ان کی داستان سے ظاہر ہے۔

۵۔ محمد ابن مسعود عیاشی اپنی تفسیر میں ابوبکر حضرمی کے حوالے سے امام جعفر صادقؑ سے روایت کرتے ہیں کہ حضرت کی خدمت میں عرض کیا گیا "آپ کو دونوں میں سے کون

کس چیز کو پسند کرتے ہیں: کنارہ کشی یا علی علیہ السلام سے اظہار برائت کرنا۔"[۱] آپ نے فرمایا: "رخصت
پسند ہے۔ کیا تم نے عمار کے بارے میں پروردگار عالم کا قول نہیں سنا: "الا من اکرہ وقلبہ
مطمئن بالایمان"

عنقریب ہم عرض کریں گے کہ رجحان رخصت پر اس روایت کی دلالت دوسری روایت
سے ٹکراتی ہے۔ اور اس ٹکراؤ کے مجموعہ کا طریقہ بھی بتائیں گے۔

۶۔ عبداللہ ابن عجلان کے حوالے سے عیاشی امام جعفر صادق علیہ السلام سے نقل
کرتا ہے کہ عبداللہ نے امام کی خدمت میں عرض کی: کوفہ میں ضحاک ظاہر ہو چکا ہے اور ایسا محسوس ہوتا
ہے کہ ہمیں اظہار برائت کے لئے کہا جائے گا۔ فرمائیے ہم کیا کریں؟" آپ نے فرمایا: "تم اس
سے برائت کرو۔" میں نے عرض کی: "دونوں میں سے آپ کو کیا پسند ہے؟" آپ نے فرمایا
"مجھے یہ پسند ہے کہ تم عمار ابن یاسر کا طریقہ اختیار کرو۔ جب مکہ میں پکڑے گئے اور ان
سے کہا گیا کہ رسول اللہ سے بیزاری کا اظہار کرو۔ تو انہوں نے کر دیا۔ تو خداوند عالم نے آیت
کے ذریعے ان کے عذر کو بیان کیا۔ "الا من اکرہ وقلبہ مطمئن
بالایمان۔"[۲]

پہلی نظر میں اس روایت سے بھی وجوب ہی ظاہر ہوتا ہے۔ لیکن جو روایتیں برائت
کے اظہار سے ممنوعیت پر دلالت کرتی ہیں ان کی وجہ سے وجوب خطرے میں پڑ جاتا ہے۔
جبکہ یہاں کی تقیہ عمار اور ان کے والدین کی شہادت کو شاہد بناتا ہے اس امر پر دلالت کرتا

۱۔ ج ۳۔ باب ۲۹۔ الطلب امر بالمعروف۔

۲۔ ج ۱۳ ....

ہے کہ یہ روایت صرف تقیہ کی اجازت دیتی ہے اس کے وجوب پر دلالت نہیں کرتی۔

۷۔ طبرسی نے "احتجاج" میں امیرالمومنینؑ کی "کسی یونانی" سے بحث نقل کی ہے۔
آپ نے فرمایا: "میں تم کو دین خدا میں تقیہ کے استعمال کا حکم دیتا ہوں۔ جیسا کہ پروردگار عالم فرماتا ہے
"مومن مومنوں کو چھوڑ کر کافروں کو اپنا سرپرست نہ بنائیں اور جو بھی ایسا کرے گا اس کا اللہ سے
کوئی ربط نہیں۔ مگر یہ کہ تم ان سے کسی خوف کی بنا پر تقیہ کرو۔"[۱] اگر خوف لاحق ہو تو تمہیں اپنے دشمنوں
کی برائی اور فضیلت کے بیان کے موقع پر اظہار برائت اور جان پر مصیبتوں اور آفتوں کے خطرے
کے وقت ترک صلاۃ کی اجازت دیتا ہوں۔ اس لئے کہ تمہارا ہمارے دشمنوں کی برائی بیان کرنا نہ ان
کے لئے منفعت بخش ہے اور نہ ہمارے لئے مضر ہے۔ تم اگر تقیہ کے طور پر ہم سے اظہار برائت کرو
گے تو اس سے ہماری قدر نہ گھٹے گی اور درجہ کم ہوگا۔ مگر تمہارا دل ہمارے ساتھ ہو اور اس میں ہماری
محبت ہے تو زبان سے تھوڑی دیر ہم سے اظہار برائت کرنا تمہاری اس روح کی بقا ہے جس
سے تمہارا نفس تمام ہے اس مال کی حفاظت ہے جو تمہارا سہارا ہے اور اس عزت و مرتبہ
کا ضامن ہے جس کے ساتھ تم متمسک ہو۔ اس کے ذریعہ تم اس شخص سے بچے رہو گے جو
ہمارے دوستوں اور محبوں کو پہچانتا ہے۔ لہٰذا بے شک تقیہ تمہارے لئے اپنے کو ہلاک کرنے
سے افضل ہے۔ اور سلسلہ عمل منقطع کرنے سے بہتر ہے۔ اور اسی میں تمہارے مومن بھائیوں
کی بہتری ہے ...... خبردار یاد رکھو میں نے جس چیز کا تمہیں حکم دیا ہے اسے
ہرگز ترک نہ کرنا۔ اس لئے کہ اگر تم اسے ترک کرو گے تو اپنا اور اپنے بھائیوں کا خون ضائع کرو گے
اپنی اور ان کی ہستی کو برباد کرو گے اور دشمنان دین خدا کے ہاتھوں ان کو ذلیل کرو گے۔ جبکہ خدا
نے تم کو ان کا احترام و اکرام کرنے کا حکم دیا ہے .... یاد رکھو اگر تم نے
میری وصیت کی مخالفت کی تو خود تمہارے لئے اور تمہارے مومن بھائیوں کے لئے تمہارا

تمہارا فریضہ یہ ہے کہ سب وشتم کرنے والے "ناصبی" اور ہمارا انکار کرنے والے کافر سے زیادہ ہوگا۔[۱]

شاید جس وقت حضرت نے یہ حدیث ارشاد فرمائی اس وقت تک شام کے علاقے زیادہ تر اور مشرکوں کے قبضے میں ہی تھے اس لئے کہ اختیاری حالت میں نماز چھوڑ کر تقیہ مسلمانوں کے درمیان نہیں بلکہ کافروں کے درمیان ہی ہو سکتا ہے........ بہر حال بعض زمانہ کے خود کو حالات میں مبتلا کرنے سے تقیہ کرنا افضل ہے۔ اگرچہ ہماری نظر میں اس سے تقیہ کی فضیلت ظاہر ہوتی ہے۔ لیکن حدیث کے آخر میں آپ کا خبردار کرنا اور یہ فرمانا کہ تقیہ ترک کر کے تم اپنے بھائیوں کو جو نقصان پہنچاؤ گے وہ کفار اور ناصبیوں کی ضرر رسانی سے بدتر ہوگا اس مقام پر وجوب تقیہ کی روشن دلیل ہے۔ یہاں پر اسم تفضیل کا صیغہ تعین کے لئے ہے جیسا کہ آیت "اولی الارحام بعضهم اولی ببعض فی کتاب الله۔" اور روایت امام شک۔ "اصحاب بین اثنان یضرب عنق۔" میں وارد ہوا ہے...

....

لہٰذا اسے کلمۂ کفر اور اظہار برائت جیسے موارد میں تقیہ کے وجوب پر اس روایت کی دلالت مسلّم ہے۔ لیکن اس روایت کا مرسل ہونا اسے غیر معتبر بنا دیتا ہے۔ اس لئے کہ طبرسیؒ نے سند کا ذکر کئے بغیر اسے امیرالمومنین علیہ السلام سے نقل کیا ہے۔ رہ گئی تفسیر امام عسکریؑ میں اس کا مروی ہونا تو وہ اسے حجت نہیں بناتا۔

البتہ یہ اور بات ہے کہ دلالت کے ساتھ اگر اس کی سند بھی کامل ہوتی جب بھی اس پر

۱۔ ج ۱۲۔ باب ۲۹۔ الامر بالمعروف۔

عمل مشکل ہوتا ہے۔ اس لئے کہ متواتر روایتیں اس مورد میں تقیہ کے جواز پر دلالت کرتی ہیں۔ لہٰذا بہتر یہ ہے کہ ہم آئندہ ذکر ہونے والی تفصیل پر عمل کریں یا بعض اوقات کے لئے مخصوص قرار دیں۔

روایات تفصیل:

وہ روایات پیش خدمت ہیں کہ جن میں تفصیل وارد ہوئی ہے کہ سب وشتم میں تقیہ جائز ہے لیکن اظہار برائت میں جائز نہیں ہے۔

امام جعفر صادقؑ کی وہ روایت کہ جس کو "الکافی" نے اپنے اسناد کے حوالے سے نقل کیا ہے۔ "شیخ نے بھی مجالس" کی زینت بنایا ہے۔ فرماتے ہیں امیرالمومنینؑ نے فرمایا: "عنقریب تم کو مجھے برا کہنے کے لئے کہا جائے گا (العیاذ باللہ) تو تم مجھے برا کہہ دینا اور تمہیں مجھ سے اظہار برائت کرنے پر مجبور کیا جائے گا تو تم اپنی گردن پیش کر دینا اس لئے کہ میں فطرت اسلام پر ہوں۔"[۱]

(اس روایت میں مذکورہ تفصیل روز روشن کی طرح عیاں ہے کہ "سب" میں تقیہ جائز ہے جبکہ برائت میں جائز نہیں۔)

۲۔ شیخ نے دعبل خزاعی کے برادر اسماعیل کے حوالے سے امام رضاؑ کی ایک حدیث جس کو حضرت نے اپنے اجداد کے ذریعہ امیرالمومنینؑ سے بیان کی ہے نقل کی ہے فرمایا: "عنقریب تم سے مجھے برا بھلا کہنے کا مطالبہ کیا جائے گا اگر جان کا خطرہ محسوس کرو تو کہہ دینا۔ لیکن اگر مجھ سے برائت

۱۔ ج ۱۲۔ باب ۲۹۔ الامر بالمعروف۔

کرنے کے لئے کہا جائے تو ہرگز بیزاری نہ کرنا۔ اس لئے کہ میں فطرتِ اسلام پر پیدا ہوا ہوں۔۱

یہ حدیث بھی گزشتہ حدیث کی مانند تفصیل پر دلالت کرنے کے علاوہ برائت کی حرمت میں ظہور رکھتی ہے۔

۳۔ سید رضی، قدس سرہ نے نہج البلاغہ میں امیرالمومنینؑ سے روایت نقل کی ہے حضرتؑ نے فرمایا، لوگو! باخبر رہو: میرے بعد ایک ایسا شخص تم پر مسلط ہوگا جو بڑی فراخ اور کشادہ حلق والا ہوگا .... جو کچھ پائے گا سب چٹ کر جائے گا اور پھر مزید کا مطالبہ کرے گا بس تم اسے قتل کر دینا۔ حالانکہ تم ہرگز اسے قتل نہیں کر سکو گے۔ بہرحال وہ تم سے مجھے برا کہنے اور مجھ سے برائت کرنے کا مطالبہ کرے گا، تم مجھے برا کہنا اس لئے کہ وہ میرے لئے زکات ہے اور تمہارے لئے نجات لیکن مجھ سے برائت نہ کرنا اس لئے کہ میں مسلمان پیدا ہوا ہوں اور ایمان لانے اور ہجرت کرنے میں اوروں پر میں نے سبقت کی ہے۔۲

اگرچہ یہ روایت اپنے مضمون کے اعتبار سے مسعدۃ ابن صدقہ کی روایت سے ٹکراتی ہے لیکن انصاف کی بات یہ ہے کہ روایت دشمنی اور ایذا رسانی میں حد سے زیادہ تجاوز کرنے والے سے متعلق ہے جس میں کلمہ حق کا اظہار اور اس کے لئے اپنی جان کا فدیہ پیش کرنا آثار نبوت کی حفاظت کے لئے کم سے کم واجب کفائی تھا اس لئے کہ تمام دشمن علی کو ستانا اور علی کا انکار نبی کو ستانے پر سب متفق و کمربستہ ہو گئے تھے۔ اسی لئے دونوں شخصوں کو کمتر درجے والے سب و شتم جیسے منکرات میں تقیہ کی اجازت دی گئی اور برائت جیسے شدید منکرات میں تقیہ سے روک

۱۔ ج ۹، باب ۲۹، الامر بالمعروف۔

۲۔ خ ۱ ....

دیا گیا۔

خدانخواستہ اگر ہمیں بھی امیرالمومنینؑ کے دور جیسے وقت سے گزرنا پڑے جس میں آپ کی شہادت کے بعد دشمنوں نے آپ کے آثار مٹا دینا چاہے تھے تو اس وقت دشمنوں کی گردنیں اڑا دینا اور کلمہ حق کے اثبات اور باطل کے محو کر دینے کے لئے اپنی جانیں قربان کر دینا واجب ہو جائے گا۔

دوسری بحث:

اس بحث میں یہ طے کرنا ہے کہ تقیہ کے اختیار اور ترک میں سے کس کو ترجیح دی جائے۔ گزشتہ روایت "حسن" جو ان دو اشخاص کے بارے میں تھی جن کو سپاہ کذب نے گرفتار کر کے اظہار برائت پر مجبور کیا تھا، سے پتہ چلتا ہے کہ ترک تقیہ بہتر ہے۔ اس لئے کہ تارک تقیہ نے حق کا اعلان کیا جس کو اس کے لئے مبارک قرار دیا گیا۔ جبکہ دوسرے نے صرف رخصت الٰہی سے استفادہ کیا اور بس .... اسی طرح وہ تمام روایتیں جو نفرت ظاہر کرنے سے منع کرتی ہیں اور ان میں جان کی قربانی اور موت کو گلے لگانے کی ترغیب دیتی ہیں وہ ترک تقیہ کو بہتر قرار دیتی ہیں لیکن اس وقت جب بات سب و شتم سے آگے بڑھ جائے اور برائت کی نوبت آ جائے۔ ظاہر ہے کہ کفر بھی برائت ہی کے حکم میں ہے۔

ان روایات کے علاوہ ترک تقیہ کے بہتر ہونے پر جاں نثاران اہلبیت اور مجاہدین اصحاب علیؑ کا عمل جو شام کی ایک چراگاہ "مرج عذرا"۱ میں معاویہ کے حکم سے شہید کر دیئے

۱۔ شام کے قریب ایک وسیع و عریض چراگاہ ہے۔

گے جانے سے بہترین سمجھا۔

حجر بن عدی اور مرج عذرا میں شہید ہونے والے وہ چھ یا دس اہلبیت کے علاوہ جیسے میثم تمار، رشید الہجری، عبد اللہ بن عفیف الازدی، عبد اللہ بن یقطر اور سعید بن جبیر کے علاوہ وہ اسلاف کے فدائی جو مظلوم کربلا کے ساتھ شہید ہو گئے ان سب نے برائت پر شہادت کو ترجیح دے کر جانیں دے کے ایسے موقع پر ترک تقیہ کی بہترین مثال قائم کی ہے ......

...... یہ وہ زندہ جاوید ہستیاں ہیں جن میں ہر ایک کی داستان شہادت کو موافق و مخالف دونوں نے اپنے نوشتوں کی زینت بنایا ہے ......

چنانچہ "ذہبی" حجر کے بارے میں رقمطراز ہے کہ زیاد ابن ابیہ کو منبر پر جھٹلایا کرتے تھے یہاں تک کہ آپ نے اسے کنکری کا نشانہ بنایا۔ پس زیاد نے یہ قصہ معاویہ کو لکھا اور حجر کو گرفتار کر کے معاویہ کے پاس روانہ کر دیا۔ وہاں کچھ دین فروش گواہ بھی جمع ہو گئے جنہوں نے جناب حجر کے خلاف گواہی دی۔ جناب حجر کے ساتھ چھ افراد تھے۔ معاویہ نے سب کو قتل کر دینے کا فیصلہ کرتے ہوئے انہیں "مرج عذرا" کی طرف بھیج دیا ...... جب یہ حضرات عذرا پہنچے تو کہا جاتا ہے کہ معاویہ کا ایلچی آیا اور اس نے پیشکش کی کہ توبہ کریں یا اور علی سے اظہار برائت کریں۔ دس سات آدمیوں نے اس پیشکش کو حقارت سے ٹھکرا دیا جبکہ دوسروں نے قبول کر لیا۔ چنانچہ وہ دس شہید کر دئیے گئے جنہوں نے معاویہ کی پیشکش کو ٹھکرا دیا تھا۔[1]

"اعلام الوریٰ میں حکایت کی گئی ہے کہ ایک روز معاویہ عائشہ کے ہاں پہنچے تو عائشہ نے پوچھا کہ تم نے اہل عذرا یعنی حجر اور ان کے ساتھیوں کو کس بنا پر قتل کیا؟ معاویہ نے

---

[1] رسالہ مشکاۃ۔

عرض کی: اے ام المومنین! میں نے ان کے قتل کر دینے میں امت کی بہتری اور ان کو زندہ رکھنے میں امت کا فساد دیکھا اس لئے میں نے انہیں قتل کر دیا۔" .... اس پر عائشہ نے کہا میں نے رسول اللہ سے سنا ہے کہ "عذرا میں کچھ لوگ میرے بعد قتل کئے جائیں گے جن کیلئے خدا اور اہل آسمان غضبناک ہوں گے۔"

۵۱ھ یا ۵۳ھ میں ان کا قتل واقع ہوا ہے۔ "تاریخ ابن اثیر" اور کتاب ابی الفرج الکبیر میں یہ قصہ نقل ہے۔ مگر صرف حالات اور کیفیت قتل پر مشتمل ہے۔

بہر حال! یہ افراد یہاں جیسے بہت سے افراد علوم اہلبیت علیہم السلام کے ورثہ دار اور اپنی قوم میں اہلبیت علیہم السلام کے نمائندے اور ہر حال میں ان کے روشناس تھے ایسے تھا کہ یہ لوگ احکام شریعت سے آگاہ اور ناخوش گوار حوادث و واقعات میں اپنی شرعی ذمہ داریاں سے بے خبر نہیں تھے۔ پس اگر ترک تقیہ ان کی نظر میں ناپسندیدہ ہوتا یا ترک اور فعل تقیہ دونوں مساوی ہوتے تو پھر وہ ترک کو فعل پر ترجیح کیوں دیتے۔؟ اس کا مطلب یہ ہے کہ ان جیسے حالات میں ترک تقیہ ہی بہتر ہے .... اس کے علاوہ میثم تمار اور جناب عمرو بن الحمق الخزاعی وغیرہ کے حالات میں منقول بہت سی احادیث میں ہے کہ حضرت امیر المومنین علیہ السلام نے ان کو اپنی روش پر قتل کر دئیے جانے کی خبر دی تھی۔ ان کی تعریف بھی کی تھی۔ اور ان میں سے بعض پر آپ روئے بھی تھے۔ ان سارے واقعات میں دوسروں کے لئے ترغیب و تشویق موجود ہے کہ تقیہ ترک کریں۔ اگر ترک تقیہ حرام ہوتا تو امیر المومنین کا یہ فعل درست نہ ہوتا ......

...... بلکہ ساری روایتوں کا یہ مطلب ہے کہ امام معصوم نے ان لوگوں کی تعریف کی ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ آئمہ علیہم السلام نے ایسے موارد میں ترک تقیہ کو مقدم قرار دیا ہے۔

معاویہ کے ایک خط کے جواب میں امام حسن علیہ السلام نے معاویہ کو اس کی بداعمالیوں اور بے دینیوں کی واضح الفاظ میں خبر دیتے ہوئے عمرو بن الحمق، حجر بن عدی اور ان کے اصحاب کے بارے میں لکھا ہے: "اے معاویہ! کیا تم کندہ کے بھائی حجر بن عدی اور بہت سے دوسرے ایسے نماز گزاروں اور عابدوں کے قاتل نہیں ہو جو ظلم کو ناپسند کرتے تھے، بدعت کو گناہ کبیرہ سمجھتے تھے اور خدا کی راہ میں اہل ملامت کی ملامت سے خوف نہیں کھاتے تھے۔ تم نے انہیں بڑی سفاکی اور بڑی بے دردی سے قتل کیا جبکہ تم نے ان کے ساتھ وفاداری کا عہد و پیمان باندھا تھا۔

کیا تو نے صحابی رسول حضرت عمرو بن الحمق کو امان دینے کے بعد قتل نہیں کیا؟ کثرت عبادت سے جن کا بدن لاغر ہو گیا تھا ...... اور ان کا رنگ زرد ہو گیا تھا۔ جبکہ تو نے ان کو امان دی تھی اور ان کے ساتھ ایسا مضبوط عہد و پیمان باندھا تھا کہ اگر وہ عہد کسی پرندے کے ساتھ بھی کیا جاتا اور تو اس کے بعد اس کو قتل کر دیتا تو تو استخفاف عہد اور پرندے کے خلاف جرأت و جسارت کا مجرم قرار پاتا۔

بلکہ حجر اور ان کے اصحاب کے بارے میں عائشہ کی روایت سے ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت رسول خدا نے بذات خود بھی حجر پر افسوس کیا، ان کے لئے غضب کا اظہار کیا اور ان کی عظمت بیان فرمائی۔

یہ سارے مدارک اس بات کی دلیل ہیں کہ ان کا عمل مستحسن تھا، رسول اس سے خوش تھے اور اہلبیت علیہم السلام اس سے راضی تھے۔ اگر ترک تقیہ مکروہ ہوتا تو رسول اور اہلبیت کبھی بھی خوش نہیں ہو سکتے تھے۔

لیکن اس کے باوجود آپ کو معلوم ہے کہ بہت ساری روایات ان موارد میں ایسی ہیں جو تقیہ کو اچھا سمجھتی ہیں، اور رخصت الٰہی سے استفادہ کرنے کو کہتی ہیں۔ لہٰذا ہمیں یہ

تلاش کرنا ہے کہ ان روایات کے مضامین میں ہم آہنگی کیسے پیدا کی جائے۔

احادیث کے مضامین میں ہم آہنگی کا طریقہ

انصاف کی بات تو یہ ہے کہ اس سلسلہ میں بہترین وہ تفصیل ہے جس کی طرف ہم نے اشارہ کیا تھا کہ حدیثیں مختلف زمانوں اور شخصیتوں کے بارے میں ہیں۔ مثال کے طور پر اگر کوئی شخص ایک مدت کی رہبری کے عہدے پر فائز ہو، لوگ اس کی اقتدا کرتے ہوں اور وہ اہلبیت علیہم السلام سے تقرب کے عنوان سے معروف ہو، اس کے لئے ایسے موارد میں نقصان اٹھانا، مصیبتوں کو برداشت کرنا، یہاں تک کہ جام شہادت پی جانا نہ صرف یہ کہ بہتر ہے بلکہ کبھی واجب بھی ہو جاتا ہے۔ خصوصاً اس وقت جب کہ ان حوادث سے گریز کے نتیجہ میں حق کے نابود ہو جانے، ارکان اسلام کے متزلزل ہو جانے اور آخر کار دین کے متغیر ہو جانے کا اندیشہ ہو۔ "یعنی ایسے موقع پر ایسے شخص کے لئے ترک تقیہ واجب ہے۔" ....

.... اسی طرح زمانوں کے اعتبار سے اگر بنی امیہ جیسا دور ہو، خصوصاً وہ تاریک دور جو شہادت امیر المومنین علیہ السلام کے بعد تھا جس میں اسلام کی سرنوشت معاویہ کے ہاتھوں میں تھی یا اس جیسے دوسرے ادوار جن میں مشرکوں اور جاہلیت کے باقی ماندہ گروہوں اور قرآن میں مذکورہ شجرہ خبیثہ کے مصادیق نے نور خدا کو پھونکوں سے بجھا دینے اور نبی اکرم کے حقیقی اوصیاء کی فضیلتوں پر پردہ ڈالنے کی ناپاک کوششیں اس لئے شروع کر دی تھیں

تھیں تاکہ لوگ خائب و خاسر ہو کر پچھلے پاؤں پلٹ جائیں۔ اس قسم کے ادوار میں واجب ہے کہ کچھ مردانِ حق کا علم بلند کریں، تقیہ چھوڑ دیں، خدا کی روشن آیات کا اظہار کریں اور دشمنانِ دین کی سیاہ پیشانیوں کو داغدار بناتے ہوئے ظلم و طغیان کا رخ موڑ دیں۔

اگر یہ لوگ اپنی جان و مال کی پرواہ کئے بغیر راہِ خدا میں جہاد نہ کرتے تو اسلام، قرآن اور صاحبِ قرآن کا صرف اسم و ذکر بطور رسم باقی رہ جاتا۔ انصار و مہاجرین اور راہِ ہدایت میں ان کا اتباع کرنے والے اپنی جانوں کی قربانیاں دے کر گذشتہ اور آئندہ نسل کے درمیان ایک واسطۂ خیر بن گئے۔ اگر حجر ابن عدی، میثم، عمرو ابن الحمق، عبداللہ ابن عفیف، عبداللہ ابن یقطر اور سعید ابن جبیر جیسے عاشقانِ دینِ الٰہی کا جہاد نہ ہوتا تو آثارِ نبوت اور آثارِ ائمہ علیہم السلام محو کر دیئے جاتے۔ اس لئے کہ اسلامی حکومت کی فضا پر باطل کا غلبہ تھا جس نے اپنے نت نئے مظالم کے ذریعہ لوگوں کو دبا رکھا تھا۔ دعوتِ اسلامی کے تمام مرکز ان کی نگرانی میں تھے اور لوگ تو بادشاہوں کے دین پر ہوتے ہیں۔

ہمارے اس نظریہ کی تائید شیخ انصاری کی عبارت سے ہوتی ہے، فرماتے ہیں کہ "تقیہ وہاں مکروہ ہے جہاں نقصان کا تحمل تقیہ سے بہتر ہو جیسا بعض (فقہاء وعلماء) نے اظہار کلمۂ کفر کے بارے میں فرمایا ہے۔ لوگ جس کی اقتدا کرتے ہوں اس کے لئے بہتر ہے کہ وہ کلمۂ اسلام کی سربلندی کی خاطر تقیہ ترک کر دے۔"

یہ حکم صدرِ بنی امیہ یا بنی عباس سے مختص نہیں بلکہ ہر وہ زمانہ جس میں ایسے حالات درپیش ہوں اس میں بغیر کسی فرق کے یہی حکم ہے..........

لیکن اگر زمانۂ صادقین اور امام رضا علیہ السلام کے زمانے سے مشابہ ہو جس میں مسئلہ اتنا سنگین نہیں تھا تو اس میں تقیہ کرنا بہتر ہے جیسا کہ اس باب کی احادیث سے ظاہر

ہوتا ہے، لیکن استثنا پھر بھی محفوظ ہے۔

مذکورہ بالا تفصیل کی روشنی میں یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ ترکِ تقیہ اور فعلِ تقیہ کے سلسلہ میں وارد ہونے والی احادیث میں کوئی تعارض نہیں ہے۔ اس لئے کہ امیر المومنینؑ کے فوراً بعد والے زمانہ میں ترکِ تقیہ بہتر ہے جب کہ صادقین اور امام رضا کے زمانہ میں فعلِ تقیہ مستحسن ہے۔ اس لئے کہ دوسرے دور میں اسلام کو اتنا خطرہ نہیں تھا جتنا پہلے دور میں تھا لیکن دوسرے دور میں بھی یہ حکم ہر شخص کے لئے نہیں بلکہ جو لوگ امت کی رہبری کے عہدہ دار ہوں ان کیلئے ترکِ تقیہ بہتر ہے.......... رہ گیا مسئلہ ہمارے دور کا تو اس میں بھی حکم مختلف ہے۔ جیسے حالات ہوں ویسا ہی حکم ہوگا۔ حالات و حوادث کی گردش کے تحت کبھی ہمیں اصحابِ امیر المومنینؑ کی سنت اپنانا پڑے گی تو کبھی اصحابِ صادقینؑ کی پیروی کرنا پڑے گی۔

تقیۃ

پڑھی گئی نماز کا حکم

بے شک خوف کی بنا پر مخالف عقیدہ کے پیچھے نماز پڑھنا جائز ہے۔ لیکن آیا حسن معاشرت کے تقاضوں کے تحت اتحاد و دوستی برقرار کرنے کے لئے بغیر خوف پڑھنا جائز ہے یا نہیں ؟ (یہ مسئلہ قابل بحث ہے۔)

ہمارے زمانہ میں اور خاص طور سے حج کے موسم میں ان لوگوں کی جماعت میں عدم شرکت جان و مال یا عزت و ناموس کے لئے باعث خطر نہیں ہے۔ تاہم اخوت اسلامی اور حسن معاشرت کا ثبوت دینے کے لئے ان کے ساتھ نماز پڑھنا ہی زیادہ بہتر ہے اور اکثر روایات بھی اس کی شاہد ہیں۔ بلکہ شاید اس مضمون کی روایات متواتر ہوں......

...... لیکن..........

سوال یہ اٹھتا ہے کہ آیا جماعت کی نیت سے نماز پڑھے یا فرادی کی نیت سے نماز میں ظاہری طور پر شریک ہو جائے لیکن جہاں تک ممکن ہو اپنی نماز پڑھتا رہے اور افعال

میں ان کا ساتھ دیتا رہے ؟

اگر یہ کہا جائے کہ جماعت کی نیت سے پڑھے تو آیا وہ نماز کافی ہوگی یا اس کو اس نماز سے پہلے یا بعد میں اپنے مذہب کے مطابق نماز پڑھنا ہوگی ؟

اگر ہم یہ کہیں کہ اس کو جماعت میں شریک ہو کر اپنی نماز پڑھنا چاہیئے تو اس صورت میں جماعت کی ظاہری شکل کو برقرار رکھنے کے لئے اجزا و شرائط نماز میں جو کمی واقع ہوگی اس کمی کے باوجود آیا اس کی وہی نماز کافی ہوگی یا نہیں ؟

ان سوالوں کے جواب دینے سے پہلے اس مسئلہ کے حل میں بیان ہونے والی روایات کی جانچ پڑتال ضروری ہے تاکہ ان کی روشنی میں صحیح نتیجہ اخذ کیا جاسکے.........

...... روایات درج ذیل ہیں۔

۱۔ صدوق نے من لا یحضرہ الفقیہ میں زید الشحام کے حوالے سے امام جعفر صادقؑ سے نقل کیا ہے جو حضرت نے زید کو مخاطب قرار دیتے ہوئے فرمایا۔ "اے زید لوگوں کے ساتھ ان ہی جیسا اخلاقی برتاؤ کرو۔ ان کی مسجدوں میں نماز پڑھو۔ ان کے مریضوں کی عیادت کرو۔ جنازوں میں شرکت کرو۔ اگر ممکن ہو تو ان کی امامت اور اذان کے فرائض انجام دو۔ اس لئے کہ جب تم ایسا کرو گے تو وہ کہیں گے یہ ہیں جعفری۔ خدا جعفر صادقؑ پر رحم کرے۔ وہ اپنے دوستوں کی کتنی اچھی تربیت کیا کرتے تھے۔ لیکن اگر تم نے ایسا نہ کیا تو وہ کہیں گے جعفری ایسے ہی ہوتے ہیں۔ برا ہو (معاذ اللہ) جعفر صادقؑ کا جنہوں نے اپنے اصحاب کی صحیح تربیت نہیں کی۔[1]

۱۔ وسائل۔ ج ۵۔ باب ۷۵۔ ابواب جماعت۔

امام جعفر صادقؑ نے جن کی مسجدوں میں نماز پڑھنے کا حکم دیا ہے بلاشبہ اس سے مراد جماعت سے نماز پڑھنا ہے اور اطلاق مقال اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ وہ نماز کافی ہے۔ .... لیکن یہ بھی ممکن ہے کہ روایت اس جہت سے مقام بیان میں نہ ہو۔

۱۔ شیخؒ نے تہذیب میں اسحاق ابن عمار سے نقل کیا ہے۔ اسحاق کہتے ہیں۔ مجھ سے حضرت امام جعفر صادقؑ نے فرمایا۔ اے اسحاق کیا تم ان کے ساتھ مسجد میں نماز پڑھتے ہو۔! میں نے عرض کی "ہاں" حضرتؑ نے فرمایا۔ "ان کے ساتھ نماز پڑھا کرو" اس سے پہلی صف میں ان کے ساتھ نماز پڑھنے والا ایسا ہی ہے جیسے کوئی شخص راہ خدا میں جہاد کرنے کیلئے شمشیر برہنہ کر کے نکلے۔ ۱

تقریباً ایک جیسے مضمون کی حامل ان دو احادیث سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کے ساتھ جماعت کی نیت کر کے نماز پڑھنا رجحان رکھتا ہے۔ اور وہ نماز کفایت کرے گی۔ اور اسکو دوبارہ پڑھنا واجب نہیں ہے۔ مگر یہ کہ الگ سے کسی دلیل سے دوبارہ پڑھنا ثابت ہو جائے۔

حاصل کلام یہ کہ اگر ہم ان روایات کی روشنی میں فیصلہ کریں تو ان کے ساتھ جماعت کی نیت کر کے نماز پڑھنے کا حکم دینے میں ہم حق بجانب ہوں گے اور یہ کہ وہ نماز کافی ہوگی چاہے ہمارے مذہب کے برخلاف ہی کیوں نہ ہو۔ البتہ اس کو رسول اللہ کی اقتداء سے تشبیہ دینے کی وجہ یہ ہے کہ اس سے مسلمانوں کی شوکت و عظمت کا اظہار ہوتا ہے اور دشمنان

۱۔ ج ۱۲۔ باب ۵۔ ابواب صلاۃ الجماعت۔

اسلام کی جڑیں کھوکھلی ہوتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی اقتداء میں نماز پڑھنے والے کو اللہ کی راہ میں تلوار کھینچنے والے سے تشبیہ دی گئی ہے .... لیکن ان باتوں کے باوجود یہ روایات شیعہ علماء کے مسلک کے خلاف ہیں۔ جیسا کہ آگے چل کر ہم صاحب حدائق کا نظریہ نقل کریں گے "اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ روایتیں واجب العمل نہیں ہیں۔"

۲۔ محاسن میں عبداللہ ابن سنان سے مروی ہے۔ کہتے ہیں کہ میں نے امام جعفر صادقؑ کو فرماتے ہوئے سنا۔ اے لوگو! میں تمہیں تقویٰ الٰہی اختیار کرنے کی وصیت کرتا ہوں اور یہ کہ تم لوگوں کو اپنے کندھوں پر سوار نہ کرو۔ ورنہ ہو کہ تم ذلیل ہو جاؤ۔ بے شک خدائے سبحان اپنی کتاب میں ارشاد فرماتا ہے۔ "لوگوں سے اچھی باتیں کرو۔" اس کے بعد حضرتؑ نے فرمایا۔ "ان کے مریضوں کی عیادت اور ان کے جنازوں میں شرکت کرو۔ ان کے حق میں یا ان کے خلاف جیسا موقع ہو گواہی دو اور ان کے ساتھ مسجدوں میں نماز پڑھو۔" ۱

۳۔ احمد بن محمد بن عیسیٰ نے اپنے نوادر میں سماعہ سے نقل کیا ہے۔ کہتے ہیں کہ میں نے ان کے ساتھ رشتہ ازدواج قائم کرنے اور ان کے پیچھے نماز پڑھنے کے بارے دریافت کیا تو امامؑ نے فرمایا۔ "یہ بہت مشکل کام ہے جو تم سے ممکن نہیں ہوگا۔ البتہ رسول اللہؐ نے ان کے ساتھ رشتہ کیا اور علیؑ نے ان کے پیچھے نماز پڑھی۔" ۲

یہ تینوں حدیثیں بھی تعلقات کو برقرار رکھنے کی خاطر ان کے پیچھے نماز پڑھنے کے جواز پر دلالت کرتی ہیں۔ .... البتہ ممکن ہے کہ روایت علی ابن جعفر ایسے موقع سے مربوط

۱۔ ج ۸۔ باب ۵۔ ابواب صلاۃ الجماعت۔

۲۔ ج ۸۔ باب ۵۔ ابواب صلاۃ الجماعت

ہو جب انسان کو جان و مال کا خطرہ درپیش ہو۔ جیسا کہ اس روایت سے ظاہر ہوتا ہے۔ کہ "ان کی اقتدا میں نماز پڑھے اور وہ نماز کافی ہوگی۔"[1] اس کے علاوہ نماز کو نکاح کے ساتھ ذکر کرنا اس امر کا گواہ ہے کہ اس سے مراد نماز واجب کا بجالانا اور اسی کو کافی سمجھنا ہے

اسی طرح امام کا یہ فرمانا کہ یہ مشکل کام ہے جو تم سے ممکن نہیں ہوگا اسی چیز کی طرف اشارہ ہے کہ نماز جماعت کے ساتھ پڑھے۔ اس لئے کہ اگر اس سے مراد فرادی نماز ہوتی اور پہلے یا بعد میں اس نماز کا پڑھنا ضروری ہوتا تو یہ کوئی مشکل کام نہیں ہے۔ بلکہ ہر کوئی یہ با آسانی کر سکتا ہے کہ ظاہری طور پر ان کے ساتھ شریک ہو جائے۔ لیکن اپنی نماز الگ جا کر پڑھ لے۔

۲۔ صدوق نے بطور مرسل (راوی کا ذکر کئے بغیر) نقل کیا ہے۔ کہ حضرت امام جعفر صادق نے فرمایا۔ اگر تم ان کے ساتھ نماز پڑھو تو تمہارے مخالفوں کی تعداد کے برابر تمہارے گناہ بخش دیئے جائیں گے[1]

یہ روایت بھی دوسری روایات کے مانند اصل جواز پر دلالت کرتی ہے۔ لیکن اس میں اس نماز کے کافی ہونے یا نہ ہونے کی طرف کوئی اشارہ نہیں ہے۔ .... (یہ روایتیں بطور نمونہ ہم نے ذکر کی ہیں۔ تلاش کرنے والے کو بہت سی روایتیں اور بھی مل سکتی ہیں)

ان روایات کے بالکل برعکس وسائل کے چھٹے باب میں بعنوان ابواب جماعت کے تحت کچھ روایات مذکور ہیں جن سے یہ سمجھ میں آتا ہے کہ مخالف عقیدہ کے پیچھے پڑھی گئی نماز کافی نہیں ہے بلکہ یا تو پہلے اپنی نماز پڑھ لے یا بعد میں اس کا اعادہ کرے۔ بنا بر ایں جو نمازیں ان کے ساتھ پڑھے گا وہ مستحب ہوں گی اور جو پہلے یا بعد میں پڑھے گا وہ اس کی واجب نماز

۱۔ ج ۵ باب ۵۔ ابواب صلاۃ الجماعۃ

ہوگی۔ البتہ اگر تقیہ مستحب ہو تو نماز بھی مستحب ہوگی۔ لیکن اگر تقیہ خوف کی بنا پر واجب ہو تو نماز بھی واجب ہوگی۔ چنانچہ اس مضمون کی بعض روایات درج ذیل ہیں۔

۱۔ صدوق نے "فقیہ" میں عمر ابن یزید کے حوالے سے امام جعفر صادق سے نقل کیا ہے حضرت نے فرمایا۔ تم میں سے ہر وہ شخص جو گھر میں اپنی واجب نماز پڑھنے کے بعد تقیہ کرتے ہوئے ان کے ساتھ نماز میں شرکت کرے اور باوضو ہو تو خدا اس کے لئے پچیس درجہ مخصوص فرمائے گا۔ لہٰذا تم اس کو حاصل کرنے کی کوشش کرو[1]

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر ان کی اقتدا جائز ہوتی تو فرادی نماز پڑھنے کی ترغیب و طلب کا کیا مطلب تھا۔ یہ ترغیب گواہ ہے کہ ان کے ساتھ پڑھی گئی نماز کافی نہیں ہے.......... مگر خدا کے لئے کوئی یہ کہے کہ اس قسم کا احتیاط مستحب ہے۔ اس کے واجب ہونے پر کوئی دلیل نہیں ہے۔ لہٰذا یہاں کی اقتدا کے جواز سے منافات نہیں رکھتا۔ چاہے تقیہ بھی کیوں نہ ہو......... لیکن یہ کہنا آسان ہے۔ اس کا ادراک بہت مشکل ہے۔

۲۔ حضرت صدوق نے عبد اللہ ابن سنان کے واسطے سے امام جعفر صادق سے بیان کیا ہے۔ حضرت نے فرمایا۔ اگر کوئی شخص وقت میں نماز سے فارغ ہو کر دوبارہ بحالت دشمنوں کے ساتھ نماز پڑھے تو خداوند عالم پچیس درجہ اس کے لئے لکھ دیتا ہے[2]

اسی راوی کا بیان ہے کہ امام صادق نے فرمایا۔ میرے دروازے کے سامنے

۱۔ ج ۱۔ باب ۶۔ ابواب صلاۃ الجماعۃ

۲۔ ج ۲۔ ....

مسجد ہے جس میں ہمارے دشمن اور مخالف ہوا کرتے ہیں اور وہ شام تک اس میں نماز پڑھتے ہیں میں عصر کی نماز پڑھ کر نکلتا ہوں اور پھر ان کے ساتھ جا کر نماز پڑھتا ہوں۔ اس کے بعد آپ نے فرمایا کیا تم یہ نہیں چاہتے کہ تمہارے لئے پچیس نمازوں کا ثواب لکھا جائے[1]

ہمارے شیخ نے ابوالحسن اول سے نشیط ابن صالح کے حوالے سے روایت کی ہے۔ نشیط کہتے ہیں میں نے امام کی خدمت میں عرض کیا ہم میں سے ایک شخص اپنے گھر کے دروازے مقفل کر کے اپنے گھر میں بند ہو کے نماز پڑھتا ہے۔ اور پھر گھر سے نکل کر اس نماز کو اپنے ہمسایوں کے ساتھ جماعت سے پڑھتا ہے اس کا کیا حکم ہے؟ امام نے فرمایا۔ ایسے شخص کو پروردگار عالم جماعت کا دوگنا ثواب دے گا اور اس کے لئے پچاس درجے ہوں گے۔ اور وہ نماز جو وہ اپنے ہمسایوں کے ساتھ جماعت میں شریک ہو کر پڑھتا ہے اس کے لئے پیغمبر کی اقتدا میں نماز پڑھنے والے کا ثواب لکھا جائے گا۔ وہ ان کے ساتھ نماز میں شریک ہوتا ہے اور جب وہاں سے جاتا ہے تو اپنے گناہ ان کے لئے چھوڑ کر اور ان کی نیکیاں لے کر جاتا ہے[2]۔

اس روایت میں غور کرنے سے ظاہر ہوتا ہے کہ امام علیہ السلام نے اپنے جواب میں سائل کے فعل کو مستند قرار دے کر اس کے لئے ہر نماز پر دوہرا اجر بیان فرمایا ہے۔ اب اگر مخالف اور دشمن کے پیچھے پڑھی گئی نماز کافی ہوتی تو گھر میں پڑھی گئی نماز کا دوگنا اجر نہ ہوتا۔ خاص طور سے ایسے موقع پر جب وہ شخص اس قدر مجبور ہو کر گھر کے دروازے بند کر کے تنہا نماز پڑھے۔ ظاہر ہے ایسے موقع پر تقیہ جائز ہو جاتا ہے۔ لیکن پھر بھی اگر

۱۔ ج ۳۔ باب ۶ ابواب صلاۃ جماعت

۲۔ ج ۹۲ ....

کوئی شخص اپنی نماز جداگانہ ادا کرے تو وہ دوہرے اجر کا مستحق ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ مخالف عقیدہ کے پیچھے پڑھی گئی نماز کافی نہیں ہے۔ مترجم)

ممکن ہے اس حدیث سے مراد یہ ہو کہ دونوں نمازوں کو کافی سمجھنا جائز ہے گھر میں پڑھی گئی نماز کا اجر جماعت کے دوبرابر ہے۔ اور جماعت سے پڑھی گئی نماز کا اجر رسول اللہ کے پیچھے نماز پڑھنے والے کے برابر ہے۔

خلاصہ اس مطلب کی اور بھی بہت سی روایات ہیں۔ ان کے علاوہ وہ روایات بھی ہیں جو مخالف عقیدہ کی اقتداء میں پڑھی گئی نماز کو ناکافی قرار دیتی ہیں۔ اگر ہم ان روایتوں اور پہلے طائفہ کی روایتوں میں جو مخالف عقیدہ کی اقتدا کے جائز ہونے پر دلالت کرتی ہیں، جمع کرنا چاہیں تو یہ ماننا ہوگا کہ اگر تقیہ خوف کی بنا پر نہ ہو، اور نمازگزار ان کی جماعت سے پہلے یا اس میں شرکت کے بعد اپنی نماز فرادی پڑھنے پر قادر ہو تو فرادی پڑھے۔

مختصر یہ کہ اگر تقیہ تحبیبی (حفظ وحدت کے لئے) ہو اس صورت میں ان کے پیچھے پڑھی گئی نماز کو کافی سمجھنا مشکل ہے۔ اگرچہ طائفہ اولی والی روایت یہی کہتی ہیں کہ وہ نماز کافی ہے۔

یہ سب باتیں اپنی جگہ پر لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ طائفہ اولی والی روایات کی روشنی میں ان کے ساتھ جماعت میں شریک ہونا جائز ہے، دوسری روایات یہ کہتی ہیں کہ ان کی اقتدا نہیں ہے بلکہ صرف ان کے ساتھ شریک ہوتا ہے تاکہ وہ دیکھ سکے کہ ان کے ساتھ نماز پڑھ رہا ہے یہ پہلے طائفہ سے منافات نہیں رکھتیں۔ .... البتہ یہ مستحب ہے یا وہاں کام میں لائی جائیں جہاں تقیہ حفظ اتحاد کے لئے ہو۔ لیکن اگر تقیہ خوف کی بنا پر ہو تو ان کے پیچھے پڑھی گئی نماز کافی ہے۔ اس کے لئے دیکھنا باقی ہے کہ آیا اس

کفایت کے لئے تنہائی میں کسی دوسری جگہ نماز پڑھنے کا امکان ہو یا شرط ہے یا نہیں تفصیل اس مسئلہ کی تنبیہات میں آئے گی۔

تقیہ

سے متعلق ضروری مسائل

پہلا مسئلہ:

کیا تقیہ مخالف مذہب کیساتھ مخصوص ہے

جب ہم روایات کو دیکھتے ہیں تو اکثر روایتوں سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ تقیہ مخالفوں سے مخصوص ہے۔ ان روایتوں سے انسان کو یہ وہم ہوتا ہے کہ حکم تقیہ صرف مذہب کے مخالفوں کے ساتھ مختص ہے۔ بنابرایں اپنوں کے سامنے یا کفار و مشرکین کے سامنے تقیہ نہیں کیا جا سکتا.................. درج ذیل عبارت میں شیخ انصاری (رہ) اپنے رسالہ تقیہ میں فرماتے ہیں۔

تقیہ کے لئے شرط یہ ہے کہ غیر مذہب والوں سے ہو، جیسا کہ تقیہ کی اجازت دینے والی دلیلوں سے یہی متبادر ہوتا ہے کہ تقیہ غیر مذہب والوں سے مخصوص ہے۔

جس کا مطلب یہ ہے کہ حکم مذکور کافروں، اور شیعہ ظالموں کے بارے میں ہی جاری نہیں ہوگا بلکہ آئندہ ذکر ہونے والی مسعدۃ ابن صدقہ کی روایت اور تقیہ کے ذیل میں وارد ہونے والی روایتوں کے عموم سے ثابت ہوتا ہے کہ تقیہ کا حکم عام ہے یعنی غیر مذہب والے اور کافر و غیر ظالموں سب کو شامل ہے۔

مسعدۃ ابن صدقہ کی روایت میں محدود تقیہ کی جانب یوں اشارہ کیا گیا ہے: "وہ ایک ایسی عالم قوم جس کا حکم و عمل حق کے حکم و عمل کے برخلاف ہو اس قوم کے سامنے تقیہ پر بعض مومن کا ہر عمل جو دین میں فساد کا باعث نہ بنے جائز ہے۔"

مجھے اس سلسلہ میں یہ عرض کرنا ہے کہ تقیہ کے معنی کو پیش نظر رکھتے ہوئے اس میں کوئی شک نہیں کہ اصطلاح اور لغت کی روشنی میں حکم تقیہ غیر مذہب والوں سے مخصوص نہیں ہے۔ اس لئے کہ تقیہ کا مطلب اپنے عقیدہ یا دینی عمل کو پوشیدہ رکھنا ہے جس کے اظہار میں نقصان ہو اور اس کا معیار و ملاک قاعدہ اہم و مہم اور حکم معذور کو معذور پر ترجیح دینا ہے۔ یہ ایک ایسا عقلی قاعدہ ہے جس کی ہر مذہب و مشرب والے عقلاً گواہی دیتے ہیں۔ اگر کوئی شخص کچھ خاص مجبوریوں کے تحت زبان سے انکار بھی کر لے۔ تاہم دل و جان سے وہ اس قاعدہ پر ایمان بھی رکھتا ہے اور وقت پڑنے پر اس کو کام میں بھی لاتا ہے۔

یہ چیز واضح ہے کہ تقیہ غیر مذہب والوں سے مخصوص نہیں ہے بلکہ اس کو کافروں، مشرکوں اور شیعہ ظالموں کے ساتھ بھی کام میں لایا جا سکتا ہے۔ بلکہ وہ موارد زیادہ ہیں کہ جہاں کمزور و ناتواں افراد بعض شیعہ ظالموں کے سامنے تقیہ کو سپر بنا لیتے ہیں۔ اگرچہ اس قسم کا تقیہ عبادات میں نہیں ہوتا بلکہ دوسرے امور میں ہوتا ہے۔

ان کے علاوہ وہ روایات اور قرآن کریم کی وہ آیات جو کافروں اور مشرکوں سے تقیہ پر دلالت کرتی ہیں وہ بھی اس امر کی گواہ ہیں کہ تقیہ غیر مذہب والوں سے مخصوص نہیں۔ مثال کے طور پر حضرت ابراہیم کے اپنی قوم سے تقیہ کرنے پر دلالت کرنے والی آیات، مومن آل فرعون کے تقیہ والی آیتیں، عمار یاسر اور دوسرے مسلمانوں کے مشرکین مکہ سے تقیہ کے بارے میں آیتیں اور وہ روایت جو مسیلمہ کذاب کے چنگل میں گرفتار دو شخصوں کی مجبوری میں وارد ہوئی ہے جن میں سے ایک نے تقیہ سے کام لیا اور دوسرے نے اظہار حق کو ترجیح دی اور نبی اکرم ﷺ نے دونوں کے عمل کو سراہا اور دونوں کو تابع مصلحت قرار دیا۔

بلکہ قرآن مجید میں لفظ تقیہ یا تقاۃ صرف ایک جگہ استعمال ہوا ہے اور وہ بھی مشرکوں کے مقابلہ میں جس سے بخوبی واضح ہو جاتا ہے کہ حکم عام ہے۔ لہٰذا اس کے نزدیک روایات کے اطلاق و عموم یا روایت مسعدۃ ابن صدقہ سے استدلال کرنے کی ضرورت نہیں رہ جاتی اور بغیر کسی شک کے حکم تقیہ کا عموم ثابت ہو جاتا ہے۔ جبکہ اس دور میں اہل سنت کے مقابلہ میں کفار و مشرکین سے زیادہ تقیہ کرنا پڑتا ہے۔

اس بحث سے یہ بھی واضح ہو جاتا ہے کہ تقیہ کے لئے ضروری نہیں ہے کہ مورد تقیہ اہل سنت کے مذہب کا جز یا اس میں شامل ہو۔ مثال کے طور پر ترک حج تمتع ان کے تمام فرقوں کا مذہب نہیں ہے۔ اسی طرح نماز میں ہاتھ باندھنا بھی ان کے کچھ فرقوں کا طریقہ ہے جبکہ ان کے بعض علماء ہاتھ کھلے رکھنے کو جائز قرار دیتے ہیں۔ اس کے باوجود تقیہ کی ضرورت پڑ سکتی ہے تاکہ عوامی الزامات سے بچا جا سکے۔ بلکہ کبھی کبھی تو ان کی بعض عادتوں کی وجہ سے کہ جن کو وہ مذہب میں داخل سمجھتے ہیں اور ان کی رعایت ترک واجب یا مندوب یا فعل حرام کے بغیر ممکن نہیں ہوتی انسان تقیہ پر مجبور ہو جاتا ہے۔ اور اس میں کوئی شک

نہیں کہ مجبوری کے وقت تقیہ کرنا جائز ہے۔

دوسرا مسئلہ:

"تقیہ موضوعات میں"

عمامہ پر مسح کرنے، نماز میں ہاتھ باندھنے، کھلنے جیسے یا پہننے والی شلوار پر سجدہ وغیرہ جیسے شرعی احکام میں بلا شبہ تقیہ جائز ہے، اور اس مسئلہ میں بحث ہو چکی ہے۔

اس مسئلہ میں موضوع بحث یہ ہے کہ آیا موضوعات میں بھی تقیہ ہو سکتا ہے۔ یا نہیں۔ مثال کے طور پر عید کے چاند یا حج کے لئے ذی الحجہ کے چاند کی رؤیت کے بارے میں اکثر ایسا ہوتا ہے کہ ان کی حکومت چاند کا اعلان کر دیتی ہے جس کی بنا پر وہ لوگ افطار کر لیتے ہیں یا حج بجا لاتے ہیں۔ مگر شیعہ حضرات اس حکم میں ان کا ساتھ دیں تو ان کو خود ان کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ ایسے میں آیا ان کی متابعت درست ہے جب کہ شیعوں کے نزدیک چاند ثابت نہ ہو بلکہ ان کو معلوم ہو کہ چاند نہیں ہوا ہے۔؟ اور آیا ادلہ تقیہ اس مورد کو شامل ہیں یا نہیں۔؟

اس کے جواب میں عرض ہے کہ۔ شرعی احکام کے موضوعات دو طرح کے ہوتے ہیں۔

۱۔ کچھ موضوعات شرعی نوعیت کے ہیں جن کو بیان کرنا شارع کی ذمہ داری ہے مثال کے طور پر نماز کے اوقات وغیرہ۔

۲۔ بعض موضوعات محض خارجی ہوتے ہیں جن کو بیان کرنا شارع کی ذمہ داری نہیں ہے۔ جیسے رویت ہلال وغیرہ۔

پہلی قسم یعنی شرعی نوعیت کے موضوعات میں تقیہ کی دلیلیں بغیر کسی شک و شبہ کے جاری ہیں۔ اس لئے کہ اس کی بازگشت بھی اختلاف حکمی کی طرف ہے۔ جس میں بحث ہو چکی ہے............ فی الحال ہماری بحث دوسری قسم میں ہے جس کی چند صورتیں ہیں

ایک صورت یہ ہے کہ ہمیں ان کی خطاء کا علم ہو اور دوسری صورت یہ ہے کہ ہماری نظر میں ان کے حکم کی صحت مشکوک ہو۔ شک کے اسباب کئی طرح کے ہو سکتے ہیں۔ کبھی تو شک ان خارجی دلیلوں کی وجہ سے ہوتا ہے جن کو وہ اثبات موضوع کے لئے کام میں لاتے ہیں اور کبھی ان کے نزدیک معتبر اور ہمارے نزدیک غیر معتبر ہو یا بالکل غیر عرفی طریقہ اس بات کا باعث بنتے ہیں۔ مثال کے طور پر وہ گواہوں کے بارے میں تحقیق کئے بغیر ان پر اعتماد کر کے موضوع کو ثابت سمجھتے ہیں۔ اس لئے کہ ان کے نزدیک تحقیق واجب نہیں ہے جب کہ ہمارے نزدیک ہر شخص کی گواہی قابل قبول نہیں۔ اس لئے کہ اس کی بازگشت بھی اختلاف حکمی کی طرف ہے۔

بحث کے لئے جو چیز باقی رہ جاتی ہے وہ خالص خارجی موضوعات ہیں جن کا شارع سے کوئی تعلق نہیں۔ ان میں چاہے ہمیں ان کے غلطی پر ہونے کا علم ہو یا ہمیں شک ہو اور وہ موضوع ہمارے نزدیک ثابت نہ ہو........ اس میں بھی بحث کے دو محور ہیں۔ ایک محور حکم تکلیفی اور دوسرا حکم وضعی ہے۔

جب تقیہ کی شرائط جمع ہوں تو حکم تکلیفی کے اعتبار سے اہل سنت جیسا عمل کرنے میں کوئی حرج نہیں۔ چنانچہ بعض ائمہ نے بھی ضرورت کے وقت اس قسم کے تقیہ پر

عمل کیا ہے۔ امام جعفر صادقؑ نے رمضان کے آخری دن میں منصور دوانیقی کے خوف سے افطار کیا جیسا کہ بعض روایات میں وارد ہوا ہے اور ہم عنقریب اس کی طرف اشارہ کریں گے بنابریں ضرورت کے وقت جواز تقیہ پر دلالت کرنے والی تمام دلیلیں اس مورد میں عمل کی صحت پر دلالت کرتی ہیں۔ معلوم ہوا کہ حکم تکلیفی کے اعتبار سے مسئلہ روشن ہے۔

بحث صرف حکم وضعی کے اعتبار سے ہے۔ یعنی ایسی حالت میں انجام دیا گیا عمل کیا مجزی اور صحیح ہے یا نہیں۔؟ اور آیا عمل تقیہ کی کفایت پر دلالت کرنے والی گذشتہ روایتیں اس مورد کو بھی شامل ہیں یا نہیں۔؟ مثال کے طور پر روایت ابو عمر اعجمی میں ہے کہ نبیذ پینے اور موزوں پر مسح کے علاوہ ہر چیز میں تقیہ ہے۔

اس روایت سے ظاہر ہوتا ہے کہ تقیہ کی مطابقت میں عبادت صحیح ہے۔ چند موارد اس سے مستثنیٰ ہیں جن کا ذکر ہو چکا ہے۔ چنانچہ روایت زرارہ میں بھی ان کے قول سے یہی ظاہر ہوتا ہے۔ آپ نے فرمایا "تین چیزیں ایسی ہیں جن میں تقیہ نہیں کرتا نشہ آور چیز کے استعمال، موزوں پر مسح اور حج تمتع میں۔" روایات ابواب وضو اور اقسام حج میں بھی اسی طرح مذکور ہے۔

البتہ امام کی وہ حدیث جو منصور دوانیقی سے متعلق ہے جس میں آپ نے فرمایا ہے۔ اگر میں ایک دن افطار کر کے اس کی قضا بجالاؤں تو یہ مجھے اپنی گردن مارے جانے سے زیادہ پسند ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ عمل کافی نہیں ہے۔ بلکہ اس کی قضا واجب ہے۔ لیکن آخر بحث میں ہم اس کی وجہ بیان کریں گے۔ جس سے شک دور ہو جائے گا

بہر حال انصاف کی بات تو یہ ہے کہ روایات تقیہ کی عمومیت کے پیش نظر یہ کہ سکتے

موجودہ روایات میں موارد احکام کی خصوصیت کو نظر انداز کرتے ہوئے تنقیح مناط کے اعتبار سے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ان موضوعات میں بھی تقیہ پر عمل صحیح اور رافع تکلیف ہے۔ خاص طور سے حج اور چاند کی رویت کے مسئلہ پر تو ہر زمانہ میں تقیہ پر عمل ہوتا رہا ہے۔ ......

...... چنانچہ صاحب جواہر کتاب حج میں فرماتے ہیں "یہاں ایک اہم فروعی مسئلہ رہ جاتا ہے جس کا ذکر تمام مسائل سے زیادہ بہتر ہے اور وہ یہ ہے کہ اگر اہلسنت کے قاضی کے لیے دو گواہوں کے ذریعہ چاند ثابت ہو جائے جب کہ ہمارے نزدیک وہ (یوم الترویہ) ہو اور ان کے نزدیک (عرفہ) تو ایسی صورت میں کیا شیعہ حضرات ان کے ساتھ تقیۃً وقوف کر سکتے ہیں۔؟ یا ان کے لیے وقوف کافی نہیں ہوگا۔ اس لیے کہ اس موضوع میں تقیہ ثابت نہیں ہے۔ چنانچہ رمضان کے آخری دن اگر وہ عید منانے کا حکم دیں تو اس روزے کی قضا رکھنا واجب ہے۔ جیسا کہ بعض روایتیں صراحت کے ساتھ دلالت کرتی ہیں۔ منجملہ ایک روایت یہ ہے کہ "ایک روزہ چھوڑ کر اس کی قضا رکھنا مجھے اپنے قتل کر دیے جانے سے زیادہ پسند ہے۔" میں نے علماء میں سے کسی کے ہاں بھی اس طرح کا کلام نہیں دیکھا اور ایسے موارد میں بھی تقیہ پر عمل اور اس کا کافی ہونا بعید نہیں ہے۔ چونکہ اس پر عمل نہ کرنے کی صورت میں حرج لازم آتا ہے اسی طرح کا احتمال قضا میں بھی ہے اور میں نے دیکھا ہے کہ اس کی نسبت علامہ طباطبائی کی طرف دی گئی ہے۔

لیکن اس کے باوجود ترک احتیاط سزاوار نہیں ہے۔ (واللہ عالم)

یہ تھا صاحب جواہر کا نظریہ اور اس میں شک نہیں کہ نتیجہ کے اعتبار سے موصوف کا کلام متین ہے۔ لیکن اس میں چند اعتراض جواب طلب ہیں۔

اولاً یہ کہ رمضان کے آخری دن اہلسنت کے حکم کے مطابق عید منا کر اس روزے

کی قضا رکھے جانے مسئلہ کو وقوف اور دوسرے مناسک حج پر قیاس کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ چنانچہ ہم عنقریب اس کی وضاحت کریں گے

۲۔ دوسرے یہ کہ عرف حرج کا خطرہ کسی عمل کے صحیح اور کامل ہونے پر دلالت نہیں کرتا۔ بلکہ حرج کی وجہ سے ہم صرف یہ کہہ سکتے ہیں کہ وہ عمل حرام نہیں ہے۔

۳۔ تیسرے یہ کہ صاحب جواہر کا یہ فرمانا کہ "قضا میں بھی یہ صورت پیش آسکتی ہے" قابل قبول نہیں ہے۔ اس لئے کہ ائمہ کے دوروں میں چاند کے ثبوت میں اختلاف کا شائع ہونے کے سبب سے کسی کی گلو خلاصی نہیں کرتا۔

بہر حال عبادات اور غیر عبادات میں عمل تقیہ کے کافی ہونے پر وارد ہونے والی دلیلوں کی عمومیت کے پیش نظر انصاف یہ ہے کہ وہ عمل کافی ہے۔ خاص طور سے حج کے مسئلہ میں ہر زمانہ میں نسلاً بعد نسل اس پر عمل ہوتا آیا ہے اور کسی نے بھی نہ تو اعادہ واجب کیا ہے اور نہ دوبارہ وقوف کرنے کو کہا ہے۔ بلکہ فقہی کتابوں میں علماء نے اس مسئلہ کو چھیڑا بھی نہیں جیسا کہ آپ صاحب جواہر کے کلام میں دیکھ چکے ہیں

بعض بزرگ علماء اور ان کے ہم عصر تابع یا ہمارے زمانہ کے کچھ علماء نے رویت ہلال میں اختلاف والے برسوں میں جو احتیاط پر عمل کرنے کی بات کہی ہے بالکل نئی بات ہے۔ جو اس سے پہلے نہیں سنی گئی۔ اور یہ "دیبا در بند اگر چہ گندہ" کے مترادف ہے۔

مسئلۂ اکراہ اور تقیہ

علماء نے مسئلہ اکراہ کے ذیل میں کہا ہے کہ اگر کسی شخص کو روزہ افطار کرنے پر مجبور

کیا جائے تو اکثر علماء کے نزدیک اس کا روزہ درست ہے جب کہ شیخ طوسیؒ سے منقول ہے کہ وہ روزہ باطل ہے۔ اس قول کی تائید اس بات سے ہوتی ہے کہ اگر تقیہ کی بنا پر افطار کیا جائے تو اس کی قضا واجب ہے۔ اس لئے کہ تقیہ اکراہ کے مصادیق میں سے ہے۔

افطار صوم میں اکراہ کا ذکر کرتے ہوئے شیخ بزرگوار اس تصریح کے باوجود کہ "اس روزے کے صحیح ہونے میں کوئی اختلاف نہیں ہے خاص طور سے ایسے موقع پر کہ جب روزہ دار کے حلق میں زبردستی کوئی چیز ٹھونس دی جائے۔" فرماتے ہیں کہ اس دلیل کی روشنی میں جو تقیہ کی بنا پر افطار کئے گئے روزے کی قضا واجب ہونے پر دلالت کرتی ہے۔ بہتر یہ ہے کہ اکراہ کی وجہ سے افطار کئے گئے روزے کی قضا بھی واجب قرار دی جائے اس لئے کہ تقیہ بھی تقریباً اکراہ ہی کے معنی میں ہے۔ جیسا کہ روایت رفاعہ میں امام جعفر صادقؑ سے منقول ہے آپ نے فرمایا۔ ایک روز میں حیرت کے عالم میں ابو العباس کے پاس پہونچا تو اس نے کہا اے ابو عبداللہ! آج کے روزے کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟ میں نے کہا کہ یہ بات امام کے طے کرنے کی ہے۔ چنانچہ اگر تم روزہ رکھو گے تو میں بھی روزہ رکھوں گا اور اگر تم افطار کرو گے تو میں بھی افطار کر دوں گا۔ اس نے غلام کو آواز دی اور کہا دسترخوان لگاؤ۔ امامؑ فرماتے ہیں کہ میں نے اس کے ساتھ کھانا کھا لیا۔ جب کہ خدا میں جانتا تھا کہ وہ رمضان کا دن تھا۔ اس لئے ایک دن افطار کر کے اس کی قضا بجا لانا میرے لئے اس چیز سے بہتر ہے کہ میں قتل کر دیا جاؤں اور پھر کبھی اللہ کی عبادت نہ کر سکوں۔ اس کے علاوہ ایک حدیث میں ہے کہ رمضان کے مہینہ میں ایک دن افطار کر لینا مجھے اپنی گردن اڑا دیئے جانے سے زیادہ پسند ہے......

الجواہر جلد ۱۶ ص ۲۵۹

اپنے کلام کے آخر میں شیخ بزرگوار نے مسئلہ تقیہ افطار کی بیماری اور سال کی وجہ
سے خبر قضا کے ضعیف ہونے اور دلیل کراہ کے ساتھ مخصوص ہونے کے احتمال کو رد نہیں
کیا ہے .... اس کے بعد دوبارہ تحریر ابتدا ہے اور فرمایا ہے۔
احتیاط یہی ہے کہ دونوں کو ایک دوسرے میں رکھا جائے۔ اس لئے کہ ادلۂ تقیہ کی عمومیت کے
ایسے موارد کو شامل ہونے میں شک ہے جن کی بازگشت درحقیقت موضوع حکم مصداق یا
مفہوم کی طرف ہو نہ کہ حکم کی طرف۔

انصاف کی بات یہ ہے کہ اس سلسلہ میں وارد ہونے والی روایات میں سے کوئی
روایت بھی قضا کے واجب ہونے پر دلالت نہیں کرتی۔ جیسا کہ جناب صدوقؒ نے عیسیٰ ابن منصور
سے نقل کیا ہے، عیسیٰ کا بیان ہے کہ ایک روز میں حضرت امام جعفر صادقؑ کی خدمت میں تھا اور وہ
"یوم شک" تھا۔ آپ نے غلام سے فرمایا: جاؤ دیکھو آیا "سلطان" روزے سے ہے یا نہیں
غلام نے آ کر خبر دی "بادشاہ" روزے سے نہیں ہے۔ تو حضرتؑ نے کھانا منگوایا اور ہم نے
بھی آپ کے ساتھ کھانے میں شرکت کی۔ یہ روایت صرف افطار کے جواز پر دلالت کرتی ہے
وجوب قضا کے بارے میں بالکل خاموش ہے۔ باب مذکور کی دوسری، تیسری اور چھٹی روایت
کی بھی یہی حالت ہے۔

دو روایات جو یہ کہتی ہیں کہ روزہ فاسد ہے اگرچہ افطار جائز ہے۔ جس کا لازمہ وجوب
قضا ہے۔ جیسا کہ مذکورہ بالا روایت ابی العباس جو کہ صاحب جواہر کے ذیل میں ذکر ہوئی ہے
اور اسی باب کی چوتھی روایت ہے اور اسی طرح پانچویں روایت بھی جس کے ذیل میں امامؑ نے
یہ فرمایا تھا کہ ایک دن افطار کر کے اس کی قضا رکھ لینا میرے لئے قتل ہو جانے اور خدا کی عبادت
سے محروم ہو جانے سے آسان ہے۔ ان دونوں روایتوں سے وجوب قضا سمجھ میں آتا ہے

لیکن دونوں روایتیں سند کے اعتبار سے ضعیف ہیں۔

شیخ نے ابی جارود سے جو روایت نقل کی ہے اس سے یہ وہم پیدا ہوتا ہے کہ روزہ صحیح
ہے۔ روایت یوں ہے: "ابو جارود کا بیان ہے کہ میں نے ایک سال جب ہمیں قربانی کے
بارے میں شک ہوا تو امام محمد باقرؑ کی خدمت میں عرض کی بعض لوگ قربانی کرتے ہیں آپ کا کیا حکم
ہے؟ حضرتؑ نے ارشاد فرمایا: افطار، قربانی اور روزہ سب لوگوں کے ہمراہ ہے۔" روزے
کی صحت کا شبہ اس روایت سے اس دعویٰ پر مبنی ہے کہ جب لوگ افطار کرتے ہیں تو وہ
حقیقت میں افطار کا دن ہوا کرتا ہے تو ہرگز قضا واجب نہیں ہے۔ لیکن روایت کو اس
معنی پر حمل کرنا بعید ہے۔ اس روایت میں مسئلہ کا صرف ظاہری حکم بیان ہوا ہے اور وہ یہ کہ
تقیہ کی بنا پر افطار جائز ہے۔ لیکن قضا واجب نہ ہونے کے بارے میں روایت خاموش
ہے۔ لیکن اگر مان لیا جائے کہ روایت میں عدم وجوب قضا کے معنی پائے جاتے
ہیں جب بھی یہ روایت فساد پر دلالت کرنے والی گزشتہ اور آئندہ روایتوں کے مقابلہ
میں نہیں ٹک سکتی۔

اس مقام پر یہ تذکر ضروری ہے کہ تقیہ کی تمام دلیلیں جس طرح احکام کو شامل ہیں اسی
طرح موضوعات کو بھی شامل ہے۔

لیکن روزے کے افطار کا مسئلہ ایک خصوصیت کا حامل ہے۔ اور وہ یہ کہ اعمال
کے کافی اور مجزی ہونے کی بحث ان موارد میں ہے کہ جہاں عمل کا تعلق عبادت سے ہو
اور تقیہ کی وجہ سے وہ عمل سنیوں کے مذہب کے مطابق بجا لایا جائے تو ایسے موقع پر کہا
جا سکتا ہے کہ قضا ساقط ہے اور وہ عمل کافی ہے۔ لیکن اگر عمل کو سنیوں کے مذہب میں نہ
ہونے کی بنا پر ترک کر دیا جائے تو اس عمل کی قضا ساقط ہونے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔

دوسرے لفظوں میں یہ عرض کرنا مناسب ہوگا کہ مجبوری کی وجہ سے ہوتا ہے۔ چنانچہ تقیہ میں انجام دیے جانے والا عمل واقعی کے بدلے اضطراری ہوتا ہے۔ جیسا کہ تیمم سے پڑھی جانے والی نماز وضو سے پڑھی جانے والی نماز کا بدل ہوتی ہے۔ اور اس بدلیت کا منشا اس عمل کو جزئی کہا جاتا ہے۔ اگر کسی عمل کو اس بناء پر ترک کیا جائے کہ وہ واجب نہیں ہے تو ظاہر ہے کہ وہ عمل واجب کا بدل نہیں ہو سکتا اور یہی اس سے تکلیف ساقط ہوتی ہے۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب تقیہ کی بناء پر ادا ساقط ہو جاتی ہے تو قضا بھی ساقط ہونا چاہیے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ اگر شرط تقیہ موجود ہوں تو ترک قضا بلا مانع ہے۔ مثال کے طور پر کوئی شخص مخالف مذہب کے ساتھ رہتا ہے اور اس کے عمل سے معلوم ہو جائے کہ جو کہ وہ قضا بجا لا رہا ہے تو ایسے موقع پر قضا ساقط ہے۔ لیکن یہ شاذ و نادر ہی ہوتا ہے بلکہ یہ ایسا فرض ہے جس کا مصداق ملنا ناممکن ہے۔ لہٰذا جب قضا میں تقیہ نہیں ہے تو قضا بجا لانا واجب ہے۔

تیسرا مسئلہ ۱۷

آیا تقیہ کی شروعیت کے لئے اس سے فرار کا راستہ نہ ہونا معتبر ہے یا نہیں؟

اس مسئلہ میں چند قول ہیں۔ ایک قول یہ ہے کہ تقیہ ہر حال میں درست ہے چاہے اس سے راہ فرار ممکن ہو یا نہ ہو۔ شہید اول، شہید ثانی اور محقق ثانی نے اپنی کتابوں میں اسی

کو بیان کیا ہے۔

دوسرا قول صاحب مدارک کا ہے۔ جن کا نظریہ ہے کہ ہر صورت راہ فرار کا نہ ہونا معتبر ہے۔

تیسرا قول تفصیل پر مبنی ہے۔ فرماتے ہیں کہ اگر متعلق تقیہ ایسا عمل ہو جس میں کسی خاص دلیل کی بناء پر تقیہ کی اجازت ہو تو اس میں اس شرط کا پایا جانا معتبر نہیں ہے۔ جیسا کہ نماز میں ہاتھ باندھ کے پڑھنے میں دلیل خاص کی بناء پر تقیہ صحیح ہے لیکن اگر تقیہ کی دلیل خاص نہ ہو بلکہ وہ عمومات ہوں جو ہر ضرورت اور مجبوری میں تقیہ کو جائز قرار دیتے ہیں۔ جیسے نبیذ سے وضو کرنا یا قبلہ کے علاوہ رخ کر کے نماز پڑھنا تو اس صورت میں عمل اسی وقت صحیح ہوگا جب اس کے علاوہ کوئی چارہ نہ ہو۔ اس لئے کہ اگر راہ فرار ممکن ہو تو اسے اضطرار و مجبوری نہیں کہتے۔ اس تفصیل کو محقق ثانی کے حوالے سے بیان کیا گیا ہے۔"

چوتھا قول وہ تفصیل ہے جس کو شیخ بزرگوار علامہ انصاری نے اختیار کیا ہے۔

فرماتے ہیں کہ اس مسئلہ کی تین صورتیں ہیں۔

۱۔ پہلی صورت یہ ہے کہ مکلف تکلیف واقعی کے بجا لانے پر زمان اور جگہ کی تبدیلی کے بغیر قادر ہو۔ مثال کے طور پر ظاہر میں اس کا عمل جس سے تقیہ کر رہا ہے اس جیسا ہو جب کہ حقیقت میں وہ اپنا صحیح عمل انجام دے رہا ہو۔ مثلاً ان کے امام کے پیچھے نہایت دھیرے قرأت کرے اور ان کو یہ دکھائے کہ خاموش ہے۔ فرماتے ہیں کہ اس صورت میں تقیہ درست نہیں ہے۔ اس لئے کہ اس میں جگہ اور وقت کی تبدیلی کے بغیر راہ فرار ممکن نہیں ہے۔

۲۔ دوسری صورت یہ ہے کہ وقت کے ایک حصہ میں تقیہ کی ضرورت در پیش ہو۔

مثلاً اگر اول وقت نماز پڑھنا چاہے تو بغیر تقیہ کے نہ پڑھ سکے جب کہ بعد میں پڑھ سکتا ہو ایسی صورت میں تقیہ صحیح ہے۔ اس لئے کہ پورے وقت میں راہ فرار کا نہ ہونا شرط نہیں ہے۔

۳۔ تیسری صورت یہ ہے کہ کسی خاص جگہ تقیہ ضروری ہو، تمام جگہوں پر اس کی ضرورت نہ ہو۔ مثلاً مسجد الحرام یا مسجد النبی میں عمل بجالانا چاہے تو بغیر تقیہ کے ممکن نہ ہو جبکہ دوسرے مقامات پر تقیہ کے بغیر صحیح عمل بجالا سکتا ہو۔ اس صورت میں بھی عمل جاری ہے اور تقیہ درست ہے۔ اس لئے کہ ہر جگہ راہ فرار کا نہ ہونا شرط نہیں ہے۔ بلکہ مقام عمل میں راہ فرار کا نہ ہونا شرط ہے۔

لیکن ہمارا نظریہ یہ ہے

پہلی بات یہ ہے کہ تمام اقوال تقیہ خوفی سے مربوط ہیں۔ اور مداراتی تقیہ سے ان کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ اس لئے کہ مداراتی تقیہ میں وقت یا جگہ تبدیل کرنے کی ضرورت نہیں بلکہ اسی جگہ اور اسی وقت عمل بجالائے تاکہ ان روایتوں پر عمل ہو سکے جن سے پتہ چلتا ہے کہ اس قسم کا تقیہ دلوں کو نزدیک کرنے اور مسلمانوں میں اتحاد پیدا کرنے کے لئے شروع کیا گیا ہے۔ لہٰذا اس میں راہ فرار کا نہ ہونا معتبر نہیں ہے۔ (یعنی اگر راہ فرار ممکن بھی ہو تب بھی تقیہ کر سکتے ہیں۔) کیا امام کے اس قول کو "کہ ان کے مریضوں کی عیادت کرو، ان کے جنازوں میں شرکت کرو" یا اس قسم کے دوسرے قول کو اضطرار پر محمول کر کے کہا جا سکتا ہے کہ امام کی مراد یہ ہے کہ اگر راہ فرار ممکن نہ ہو تو تقیہ کرتے ہوئے ان کے ساتھ ان امور میں شرکت کر سکتے ہو؟ ہرگز نہیں۔

اس میں کسی بحث کی گنجائش ہی نہیں ہے۔

البتہ اگر ہم یہ کہیں کہ اس قسم کے تقیہ میں انجام دیا گیا عمل کافی ہے تو شیخ انصاری کی بیان کی ہوئی صورتوں میں سے پہلی صورت کو جس میں انہوں نے فرمایا ہے کہ اگر بغیر کسی تبدیلی کے اسی جگہ صحیح عمل بجالانے پر قادر ہو تو اس میں تقیہ درست نہیں ہے۔ مستثنیٰ کیا جا سکتا ہے اس لئے کہ روایات اس صورت کو شامل نہیں ہیں۔

دوسری بات یہ ہے کہ تقیہ خوفی میں بلاشبہ پورے وقت میں تقیہ سے بچنے کا راستہ نہ ہونے کی شرط معتبر نہیں ہے۔ اس کی دلیل اجماع اور عمومات تقیہ میں نہیں۔ اس لئے کہ اجماع اس مسئلہ میں معتبر نہیں اور عمومات تقیہ مطلق اضطرار کو شامل ہیں۔ جو پورے وقت میں ہو۔ بلکہ اس کی دلیل وہ خاص روایتیں ہیں جو تقیہ کی حالت میں ان کے ساتھ نماز پڑھنے کا حکم دیتی ہیں۔ اور ان کو "پورے وقت میں مضطر ہونے" پر حمل کرنا فرد نادر پر عمل کرنے کے مترادف ہے۔

اسی طرح اگر انسان دوسری جگہ صحیح عمل بجالانے پر قادر ہو تب بھی مسجد ہی میں نماز ترک کرتے ہوئے تقیہ سے بچنا اور اپنے گھر میں جا کر نماز پڑھنا واجب نہیں ہے۔ چنانچہ اس سلسلہ میں بہت سی روایتوں میں سے بطور نمونہ ذیل میں[1] چند روایتیں نقل کی جاتی ہیں۔

۱۔ احمد بن ابی نصر بزنطی امام رضا علیہ السلام سے نقل کرتے ہیں کہ میں نے امام کی خدمت میں عرض کی میں نماز مغرب میں اہل سنت کے ساتھ شریک ہوتا ہوں۔ وہ لوگ اس قدر جلدی نماز پڑھتے ہیں کہ میں اذان و اقامت کہنے کے بغیر صرف "سورہ حمد" ان کے ساتھ پڑھ پاتا ہوں۔ کیا میری نماز درست ہے؟ مولا نے فرمایا کہ تمہارے لئے صرف "سورہ حمد" پڑھ لینا کافی ہے

۱۔ ج ۵ باب ۳۳۔ ابواب صلاۃ الجماعۃ

صاف ظاہر ہے کہ یہاں ترک سورہ مجبوری کی حالت میں نہیں ہے۔

۱۔ بکر ابن اعین کا بیان ہے کہ میں نے حضرت ابو عبداللہؑ سے سوال کیا کہ ناصبی کی اقتداء میں نماز پڑھنے کا کیا حکم ہے۔؟ فرمایا جب وہ بلند آواز سے پڑھے تو تم خاموشی سے سنتے رہو اور اس کے بعد اپنے رکوع اور سجدے بجا لاؤ۔[1]

۲۔ زرارہ سے مروی ہے کہ امام محمد باقرؑ نے فرمایا کہ ناصبی کے پیچھے نماز پڑھنے میں کوئی حرج نہیں ہے اور اس کی قرأت کو اگر تم سن رہے ہو تو تمہیں خود سے پڑھنے کی ضرورت نہیں بلکہ وہی کافی ہے۔[2]

دوسری اور تیسری روایت کو تقیہ پر حمل کرنا ضروری نہیں ہے۔ اس لئے کہ اس طرح اکثر موارد میں انسان تقیہ سے بچ سکتا ہے۔ مثلاً یا تو گھر میں نماز پڑھ کے یا اس نماز سے پہلے یا بعد اپنی نماز ادا کر لے۔

۳۔ ابی بصیر لیث مرادی کا بیان ہے کہ میں نے امام محمد باقرؑ سے عرض کی کہ جس کی ہم اقتداء نہیں کرتے اس کے ساتھ نماز کیسے پڑھی جائے۔؟ حضرت نے فرمایا تم ہر عمل ان سے پہلے بجا لاؤ۔ اس لئے کہ تم حمد میں ہو۔ لیکن اگر وہ تم سے پہلے فارغ ہو جائیں تو تم قرأت چھوڑ کر ان کے ساتھ رکوع میں چلے جاؤ۔[3]

اس روایت سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہر حالت میں ان کے ساتھ پڑھی گئی

۱۔ ج ۳، باب ۳۴، ابواب صلاۃ جماعۃ۔

۲۔ ۵۔ ،، ،، ،، ،،

۳۔ ۱۰۔ ،، ،، ،، ،،

نماز کافی ہے چاہے انسان کسی جگہ اپنی نماز پڑھے پر قادر ہی کیوں نہ ہو۔

۵۔ حمران حضرت ابو عبداللہؑ سے کتاب علی علیہ السلام کا حوالہ دیتے ہوئے نقل کرتے ہیں کہ کتاب مذکور میں ہے کہ جب وہ وقت کے اندر جمعہ قائم کریں تو تم ان کے ساتھ جمعہ میں شرکت کرو اور اس وقت تک اپنی جگہ سے حرکت نہ کرو جب تک دو رکعتیں اس کے علاوہ نہ پڑھ لو۔ میں نے عرض کی "اس کا مطلب یہ ہوا کہ ہم نے چار رکعت نماز پڑھی"! فرمایا "ہاں"۔[1]

یہ روایت بھی بطور مطلق نماز کے کافی ہونے پر دلالت کرتی ہے۔

۶۔ حمران ابن اعین سے مروی ہے کہ میں نے امام محمد باقرؑ کی خدمت میں عرض کی۔ میں آپ پر قربان! یہ لوگ جب جمعہ کی نماز وقت کے اندر ادا کریں تو میں ان کے ساتھ نماز پڑھ لوں۔؟ فرمایا "ہاں"۔ یہ خبر سے کر حمران زرارہ کے پاس پہنچا اور خبر دی کہ ہمیں ان کے ساتھ نماز پڑھنے کا حکم دے دیا گیا ہے۔ زرارہ نے کہا بغیر دلیل کے ایسا ممکن نہیں۔ حمران نے کہا، چلو خود امامؑ سے سن لو۔............ چنانچہ حمران کا بیان ہے کہ ہم حضرت کی خدمت میں پہنچے اور زرارہ نے عرض کی: "حمران نے مجھ سے یوں بیان کیا ہے کہ آپ نے ہمیں ان کے ساتھ نماز پڑھنے کا حکم دیا ہے تو مجھے یہ بات ناگوار معلوم ہوئی۔ تو امام نے فرمایا حسین ابن علیؑ ان کے ساتھ دو رکعت پڑھتے تھے اور ان لوگوں کے فارغ ہو جانے کے بعد دو رکعتیں پڑھا کرتے تھے اس کا مطلب یہ ہے کہ جب وہ پڑھا کرتے تھے تو تمہیں کیا اعتراض ہے۔

اس روایت میں ان کے ساتھ نماز پڑھنے کا حکم مطلق ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ یا تو یہی دو رکعتیں پڑھنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے یا پھر اسی جگہ الگ سے دو رکعتیں اضافہ کرنا

۱۔ ج ۱۲، باب ۲۹، ابواب الجمعۃ۔

ضروری ہے کہ جہاں ممکن ہو۔ اور تقیہ ایسی حالت میں ہو کہ جہاں انسان اسی وقت میں قتل ہونے کا بغیر تقیہ سے بچ سکتا ہو۔ پھر بھی پہلی دو رکعتوں میں قرأت کے اعتبار سے بدستور تقیہ باقی رہے گا۔

تمام روایات کا خلاصہ یہ ہے کہ تقیہ سے بچنے کا راستہ نکالنا امکان اور بس کے اعتبار سے ضروری نہیں ہے۔ چاہے تقیہ بطور روایات میں ہو یا تمام دوسرے موارد میں اگرچہ اطلاقات تقیہ کہ جو بظاہر ضرورت تقیہ سے مقید میں کسی چیز پر دلالت نہیں رکھتے۔

چوتھا مسئلہ

محور تقیہ خوف شخصی ہے یا خوف نوعی

تقیہ میں خوف معتبر ہے۔ چاہے خوف گمان ہو یا شک۔ بلکہ اگر احتمال ضعیف بھی بعض عقلاء کے نزدیک معتبر ہو۔ عرف عام میں تینوں صورتوں میں عنوان خوف صادق آتا ہے اگرچہ تمام خوف قوی یا ضعیف ہو جو اس کے حکم کے متفاوت ہونے پر اثر انداز ہوتا ہے۔ حق واضح یہ ہے کہ خوف کی دو صورتیں ہو سکتی ہیں۔

پہلی صورت:

کسی تقیہ کرنے والے کو اپنی جان، مال، آبرو یا کسی ایسی چیز یا شخص کا خوف ہوتا ہے جو اس سے وابستہ ہو۔ یا کسی ایسے شخص کے بارے میں خوف ہو سکتا ہے جو اس سے متعلق نہ ہو۔

دوسری صورت:

اور بعض اہل حق ہمارے کسی ایسے شخص یا جماعت کے متضرر ہونے کا خوف ہو سکتا ہے کہ جو دشمنوں کے حصار میں ہو، وہ تقیہ ترک کرنے کی صورت میں ان پر سختی کئے جانے کا اندیشہ ہو۔

پہلی صورت کا حکم

پہلی صورت میں یعنی خوف شخصی کے موقعوں میں بلاشبہ احکام تقیہ جاری ہوں گے۔ بلکہ یہ صورت تقیہ کے کھلے مصادیق میں سے ہے جس کی تائید ان روایات سے ہوتی ہے جن میں تقیہ کو سپر وغیرہ کہا گیا ہے۔ ان کے علاوہ درج ذیل بعض روایات میں کھلا حکم بیان ہوا ہے۔

۱۔ حدیث شرائع دین میں اعمش نے امام جعفر صادق علیہ السلام سے روایت بیان کی ہے۔ حضرت نے فرمایا۔ تقیہ کے مذہب میں کسی کا قتل یا کسی کا قتل جائز نہیں ہے۔ مگر یہ کہ وہ قاتل ہو یا مفسد فی الارض ہو...... البتہ ایسے آدمی کو بھی اس وقت تک قتل نہ کیا جائے جب تک تمہیں اپنی یا اپنے دوستوں کی جان کا خطرہ نہ ہو۔ یاد رکھو کہ دار التقیہ میں تقیہ کا استعمال واجب ہے۔ ۱۔ ج ۲ باب ۲۴ امر بالمعروف۔

روایت سے ظاہر ہے کہ محور تقیہ کے سلسلہ میں تحقیقی خوف شخصی ہے۔

۲۔ امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا: جو شخص تقیہ اختیار کر کے اپنے آپ کو لوگوں سے محفوظ نہ رکھے وہ ہم میں سے نہیں ہے۔ ج ۲، باب ۲۴ امر بالمعروف

۳۔ تفسیر امام حسن عسکری علیہ السلام میں امیر المومنین علیہ السلام نے فرمایا ہے

کہ تقیہ مومن کے ان بہترین اعمال میں سے ہے جن کے ذریعہ وہ ظالموں سے اپنے نفس کو اور اپنے بھائیوں کو محفوظ رکھتا ہے .... اپنے بھائیوں کے حقوق کی ادائیگی متقین کے شریف ترین اعمال میں سے ہے۔[1]

ابواب امر بالمعروف کے ساتھ ہی باب میں اور بھی بہت سی روایات ہیں جو اس موضوع پر دلالت کرتی ہیں۔ جن میں تقیہ کو بھائیوں کے حقوق کی ادائیگی کے ذیل قرار دیا گیا ہے۔ اور گمان غالب یہ ہے کہ تقیہ بھائیوں کے حقوق میں سے ایک حق ہو جس کا علیحدہ اس کے ساتھ ذکر کیا گیا ہو اس لئے کہ تقیہ کے ذریعہ بھائیوں کے حقوق کی حفاظت ہوتی ہے۔ یا یوں کہا جائے کہ جس طرح اپنی جان اور اپنے حق کی حفاظت کے لئے تقیہ واجب ہے اسی طرح اپنے بھائی کے حق و جان کی حفاظت بھی اس کے ذریعہ واجب ہے۔

اسی طرح وہ روایات بھی دلالت کرتی ہیں جن کے مطابق ترک تقیہ اپنے کو ہلاکت میں مبتلا کرنے کے مترادف ہے۔ اس طرح کی روایات بہت سی ہیں۔ معلوم ہوا کہ جس طرح اپنے نفس کو ہلاکت میں ڈالنا حرام ہے اسی طرح ترک تقیہ کے ذریعہ اپنے بھائیوں کو بھی ہلاکت میں مبتلا کرنا حرام ہے۔

دوسری صورت کا حکم

تقیہ کرنے والے کو خود کوئی خطرہ نہ ہو مگر کسی دوسری جگہ کے عام شیعہ افراد کو اس کی وجہ سے نقصان پہنچنے کا سخت اندیشہ ہو۔ مثال کے طور پر کسی مومن کے ہاں کسی

۱۔ ج ۳۔ باب ۲۸۔ ابواب امر بالمعروف۔

شہر کے غیر مذہب والے مہمان کے طور پر آئیں جبکہ اس شہر میں اس مومن کے رشتہ دار بھی رہتے ہوں۔ اگر وہ مومن ان غیروں سے تقیہ نہ کرے تو اس کے رشتہ داروں اور وہاں کے شیعوں کو نقصان پہنچنے کا خطرہ لاحق ہو جائے (احتمالی طور پر) متضرر ہونے والا ایک شخص ہو یا ایک جماعت ہو اس صورت میں بھی تین دلیلوں سے تقیہ جائز ہے۔

پہلی دلیل: ملاک تقیہ اور قاعدۂ اہم و مہم کی رعایت ہے۔

دوسری دلیل: چونکہ فہرست تقیہ کی ستائش ہے لہذا تقیہ پر دلالت کرنے والی عام دلیلیں اس مورد کو بھی شامل ہیں۔

تیسری دلیل: تقیہ کی کثیر روایات (جن کو ذیل میں ہم بیان کر رہے ہیں) اس مورد بلکہ اس سے وسیع تر موارد پر بھی دلالت کرتی ہیں۔

۱۔ تفسیر امام حسن عسکری علیہ السلام میں حسن ابن علیؑ سے منقول ہے تقیہ ایسا عمل ہے جس کے ذریعہ پروردگار کسی قوم کی مشکلیں آسان کرتا ہے۔ تقیہ کرنے والے کو اس قوم کے اعمال کے برابر ثواب ملتا ہے۔ چنانچہ تقیہ کو ترک کر دینا اس قوم کو ہلاکت میں مبتلا کرنا ہے لہذا جو شخص ایسے موقع پر تقیہ کو ترک کرے اس کا شمار اس قوم کو ہلاک کرنے والوں میں ہوگا۔

۲۔ شیخ طوسیؒ کی مجالس میں ان کی اسناد کے ذریعہ درست [illegible] سے مروی ہے کہ امام جعفر صادقؑ نے فرمایا "وہ شخص ہم میں سے نہیں ہے جو کوئی خطرہ نہ ہونے کی صورت میں تقیہ کو اپنا شعار بنا کر اس شخص کو تحفظ نہ دے جو خطرہ میں ہو۔"

اس روایت کا دائرہ عمل وسیع تر ہے۔ اس لئے کہ اس کی روشنی میں بطور حفظ ماتقدم بھی تقیہ جائز ہے۔ چاہے اس مورد میں کوئی خطرہ درپیش نہ ہو۔ چونکہ اگر بطور حفظ ماتقدم انسان تقیہ کی عادت نہ ڈالے تو ممکن ہے کہ موارد وجوب میں وہ تقیہ کی مخالفت کا مرتکب ہو جائے

پانچواں مسئلہ :

موارد وجوب میں تقیہ کی مخالفت۔

موارد وجوب میں تقیہ کی مخالفت بلاشبہ گناہ ہے۔ لیکن کیا جو عمل انجام دیا گیا ہے وہ صحیح متصور ہوگا یا نہیں۔؟ بطور مثال تقیہ کا تقاضا ہے کہ نماز جماعت سے پڑھی جائے مگر امام جماعت کی بے عدالتی و عدم صلاحیت کے پیش نظر کوئی فرادیٰ نماز پڑھے جو تقیہ کی مخالفت کرے تو اس کی نماز صحیح ہوگی یا باطل۔؟ یا بعض مواقع پر درست ہوگی اور بعض مواقع پر باطل ہوگی۔؟

حضرت علامہ مرحوم شیخ انصاری تفصیل کے قائل ہیں۔ مرحوم کا بیان ہے کہ اگر عمل جس میں تقیہ کی مخالفت ہو رہی ہو ایسا امر ہو جو عبادات کے ساتھ متحد ہو جیسے خاک شفا پر تقیہ کی مخالفت کرتے ہوئے سجدہ کرنا تو عمل باطل ہے۔

لیکن اگر عمل عبادت کے ساتھ متحد نہ ہو بلکہ عبادات کے علاوہ ہو جیسے جہاں تقیہ کی بنا پر ہاتھ باندھنا واجب ہو وہاں "ہاتھ کھول کر نماز پڑھے" تو عمل باطل نہیں ہے۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ پہلی صورت میں شریعت نے خاک شفا پر سجدہ کرنے سے روک رکھا ہے جو عبادت یعنی سجدہ سے متحد ہے اور شریعت کی مخالفت حرام ہے۔ فعل حرام کے ذریعہ قرب الہی حاصل نہیں ہو سکتا لہذا عمل باطل ہے۔

اس کے برخلاف دوسری صورت میں فعل حرام "ہاتھ باندھنا" ہے جو ایک امر خارجی ہے لہذا عبادت صحیح ہے۔ یہ شیخ صاحب کا نظریہ ہے...... حالانکہ مسئلہ کا تعلق اس چیز

سے ہے کہ اوامر تقیہ کی حقیقت کیا ہے۔؟

بعض کہتے ہیں کہ اوامر تقیہ مثل اضطراری ہیں اور ان کا مامور بہ عمل واقعی کا بدل ہوتا ہے جبکہ کچھ حضرات کا نظریہ یہ ہے کہ یہ بدل اضطراری نہیں۔ اپنے مامور بہ کو فی نفسہ واجب قرار دیتے ہیں۔

اگر ان کو اوامر اضطراریہ کی مانند تسلیم کر لیا جائے تو تقیہ کی مخالفت سے عمل باطل ہو جائے گا۔ اس لئے کہ مامور بہ کو انجام نہیں دیا گیا ہے...... لیکن اگر یہ کہا جائے کہ ان کا مامور بہ فی نفسہ واجب ہوتا ہے تو عمل فاسد نہیں ہوگا۔ البتہ مسئلہ اجتماع امر و نہی میں اگر عبادت حرام کے ساتھ متحد ہو جائے اور ہم اس کے بطلان کے قائل ہو جائیں تو عمل فاسد ہوگا۔

چھٹا مسئلہ :

تقیہ کے بعد

کچھ اعمال ایسے ہوتے ہیں جن کا اثر تقیہ کے بعد تک باقی رہتا ہے۔ مثال کے طور پر کوئی شخص تقیہ کی حالت میں وضو کرے اور ایک وقت کی نماز پڑھنے کے بعد تقیہ کا جواز ختم ہو جائے لیکن اس کا وضو ابھی باقی ہو تو کیا اسباب تقیہ کے ختم ہوتے ہی وضو بے کار ہو جائے گا یا جب تک نئے سرے سے وضو کی حاجت نہ ہو تو نماز پڑھنا درست ہوگا۔

اسی طرح اگر کوئی عقد یا ایقاع کا صدور تقیہ کی حالت میں انجام پائے تو کیا تقیہ کے بعد اس کا اثر باقی رہے گا یا نہیں ؟

قاعدہ اولیہ کا تقاضا یہ ہے کہ تقیہ کے بعد تمام موارد میں اس عمل کا اثر باقی نہیں رہتا

ہاں مگر کسی خاص مورد میں کوئی دلیل موجود ہو۔ اگر دلیل ہو تو تقیہ کے بعد عمل فاسد ہو جائیگا اگر کوئی اس کی صحت کا دعویٰ کرے تو دیکھنا ہے کہ اس کے پاس دلیل بھی ہے یا نہیں؟

بعض لوگوں نے دعویٰ کیا ہے کہ دلیل موجود ہے جو کبھی اوامر خاص میں اور کبھی اوامر عام۔

اوامر خاص وہ ہیں جو موارد تقیہ میں وارد ہوتے ہیں۔ جیسے وضو کا حکم جس سے استفادہ ہوتا ہے کہ تقیہ کے بعد بھی وہ وضو کارگر ثابت ہو سکتا ہے اور دوسرا وضو انجام دینے کی ضرورت نہیں ہے۔

اس کی دلیل یہ ہے کہ رفع حدث امتثال امر کے آثار میں سے ہے اور اس مورد میں وضو کے ذریعہ حدث مرتفع ہو چکا ہے لہذا ہر وہ مورد کہ جس میں مثلاً وضو کا حکم موجود ہو اس میں وضو انجام دینے سے حدث رفع ہو جاتا ہے۔ کیا آپ کی نظر میں ایسا کوئی مورد ہے کہ جس میں وضو کا امر موجود ہو اور اس کے انجام دینے سے حدث رفع نہ ہوتا ہو؟

دائم الحدث کے متعلق جو کہا جاتا ہے کہ وضو اس کے لئے صرف مبیح صلاۃ ہے وہ دائم الحدث ہونے کی وجہ سے ہے ورنہ وضو رافع نہیں ہے۔

نتیجہ یہ نکلا کہ جس مورد میں بھی بعض اسباب شرعیہ کے بارے میں تقیہ کے وقت خاص امر وارد ہوا ہو چاہے وہ امر وضو اور غسل کے مانند عبادات میں سے ہو یا نکاح اور طلاق کی طرح عقود و ایقاعات میں سے ہو۔ وہ امر خود شرعاً اس کے موجود ہونے کی دلیل ہے لہذا اس کے تمام اثرات مرتب ہوں گے۔ چاہے اسباب تقیہ موجود ہوں یا زائل ہو گئے ہوں۔

رہ گئیں وہ عام روایات جن کے مطابق ہر ضرورت کے وقت تقیہ جائز ہے

اور نبیذ کے استعمال اور موزوں پر مسح کرنے کے علاوہ ہر چیز میں تقیہ ہے۔ ان کے بارے میں گزشتہ بحثوں میں عرض ہو چکا ہے کہ یہ ہر حال میں تقیہ کے جائز ہونے پر دلالت کرتی ہیں۔ ہر چیز کا جواز اس کے حسب حال ہوتا ہے۔ وضو کا جواز رفع حدث میں ہے۔ بیع و شراء کا جواز اس کے صحیح ہونے کی دلیل ہے جس کا نتیجہ حصول ملکیت ہے اور طلاق کا جواز مرد و عورت میں جدائی کی علامت ہے۔

لیکن ان باتوں کے باوجود دونوں موارد میں اشکال ممکن ہے۔ عام روایتوں کی دلالت میں یہ اشکال ہے کہ ان سے جواز تکلیفی اور نفی حرمت مستفاد ہوتے ہیں۔ ......
...... جواز وضعی ان سے سمجھ میں نہیں آتا۔ لہذا ان کے ذریعہ آثار وضعیہ (جیسے عقود و ایقاعات) کی صحت پر استدلال بہت مشکل ہے۔

اوامر خاصہ میں مشکل یہ ہے کہ وہ ہماری بحث کے موضوع کو شامل نہیں ہیں۔ ان کی حیثیت اوامر اضطراریہ جیسی ہے پانی اگر میسر ہو جائے تو وضو ختم ہو جاتا ہے بالکل اسی طرح تقیہ کے بعد یہ اوامر بھی کالعدم ہو جاتے ہیں۔

علاوہ بریں اہل نظر جانتے ہیں کہ تقیہ امر شرعی ہونے سے پہلے امر عقلی ہے اور عقلا اسی وقت تک اس امر پر عمل کرتے ہیں جب تک تقیہ باقی رہے۔ جہاں تقیہ کے اسباب زائل ہوئے وہیں عقلا کے نزدیک یہ اوامر ختم ہو جاتے ہیں اور وہ تقیہ سے پہلے والے اوامر اختیاریہ کی طرف رجوع کرتے ہیں۔

حاصل کلام یہ ہے کہ زوال تقیہ کے بعد ظرف تقیہ میں انجام دیئے گئے وضو یا غسل جیسے دیرپا اثر رکھنے والے عمل کا شرعاً اثر باقی رہنا بہت مشکل ہے۔

ساتواں مسئلہ:

آیا تقیہ واجب نفسی ہے
یا واجب غیری ——؟

موارد وجوب میں آیا تقیہ بنفسہ واجب ہے یا بطور مقدمہ حفظ نفوس و صیانت دین کے لئے واجب ہے؟

ج: تقیہ پر سرسری نگاہ ڈالنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ تقیہ مقدمہ کے طور پر واجب ہے پیش آنے والے دینی یا دنیاوی ضرر کو دفع کرنے کے لئے واجب ہے۔ دلیل عقل بھی اس سے زیادہ پر دلالت نہیں کرتی۔ اسی طرح وہ دلیل جس کے بموجب ترک تقیہ اپنے کو ہلاکت میں ڈالنے کے مترادف ہے اس کا مفاد بھی یہی ہے کہ جان کو بچانے کے لئے تقیہ واجب ہے۔

لیکن انصاف کی بات یہ ہے کہ تقیہ اپنے اثر کے اعتبار سے واجب نفسی ہے۔

اس کی دو وجہیں ہیں۔

پہلی وجہ یہ ہے کہ جو دلیلیں خوف کے وقت تقیے پر دلالت کرتی ہیں ان کی عمومیت سے وجوب نفسی کا اظہار ہوتا ہے چاہے ترک تقیہ سے نقصان ہوتا ہو یا نہ ہوتا ہو جو حفظ نفوس جس کو تقیہ کی علت قرار دیا جاتا ہے وہ اس کے لئے علت نہیں ہے بلکہ اس کا فلسفہ ہے۔ اسی لئے تارک تقیہ کو عذاب سے ڈرایا گیا ہے۔ جیسا کہ تفسیر امام حسن عسکری ع کی ایک حدیث میں وارد ہوا ہے (ہماری ولایت یا ہم سے دوستی کے بعد تم پر سب سے بڑی ذمہ داری اپنے نفوس اور اموال اور معارف کی حفاظت کے لئے تقیہ استعمال کرنا اور اپنے ہم نوعوں کے حقوق ادا کرنا ہے اس کے علاوہ بے شک خدا ہر گناہ کو بخش دے گا اور

ان کا حساب نہیں لے گا۔ رہ گئے یہ دو فریضے تو ان سے سخت عذاب برداشت کرنے کے بعد ہی نجات مل پائے گی)

اسی طرح وہ روایتیں جو ترک تقیہ کو اپنے بھائیوں کے حقوق پامال کرنے کے مترادف قرار دیتی ہیں۔ مثال کے طور پر تفسیر مذکور میں علی بن حسین کا قول ہے۔ (خدا مومن کے تمام گناہوں کو بخش دے گا، دنیا و آخرت میں اسے پاک و پاکیزہ قرار دے گا صرف دو گناہوں کے علاوہ۔ وہ دو گناہ ترک تقیہ اور اپنے بھائیوں کے حقوق ضائع کرنا ہیں)

اس کے علاوہ ابن ادریس کی سرائر کے آخر میں ایک روایت ہے جس کو علی ابن محمد (علیہ السلام) سے نقل کیا ہے۔ حضرت علیہ السلام نے داؤد صرمی سے فرمایا (اگر میں یہ کہوں کہ تارک تقیہ تارک صلاۃ کے مانند ہے تو میں اپنی گفتار میں سچا ہوں)

اور بھی بہت سی روایات ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ تقیہ واجب نفسی ہے۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ ترک تقیہ اپنے کو ہلاکت میں ڈالنا ہے، اور یہ فعل تقیہ کی ضد ہے تقیہ کے لئے مقدمہ نہیں ہے۔ ہم جانتے ہیں اپنے نفس کو ہلاکت میں ڈالنا بنفسہ حرام ہے۔ پس ترک تقیہ بھی بنفسہ حرام ہے جو موجب عقاب اور باعث فسق ہے۔ معلوم ہوا کہ تقیہ کا وجوب نفسی ہے۔

آٹھواں مسئلہ:

تقیہ کی تیسری قسم۔

گزشتہ بحثوں میں آپ ملاحظہ کر چکے ہیں کہ تقیہ کی دو قسمیں ہیں۔

۱۔ تقیہ خوفی۔ ۲۔ تقیہ تحبیبی۔

پہلی قسم کو جان و مال، عزت و آبرو اور دین کے تحفظ کے لئے کام میں لایا جاتا ہے جب کہ دوسری قسم میں تقیہ سے غرض مسلمانوں کی صفوں میں وحدت پیدا کرنا ان کے درمیان محبت اور مودت ایجاد کرنا اور ان کے اختلافات کو ختم کرنا ہے تاکہ اسلام کے دشمنوں کا مل کر مقابلہ کر سکیں۔

کہا جاتا ہے کہ تقیہ کی ایک تیسری قسم بھی ہے جس کو کسی راز کی حفاظت کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔ بلاشبہ یہ حکم سیاسی نوعیت کا ہے نہ ایجاد محبت و مودت کے لئے ہے اور نہ ہی کسی خوف کی بنا پر بلکہ خالص سیاسی نقطۂ نظر سے اسے حفظ مذہب کے لئے مشروعیت دی گئی ہے۔

وسائل میں اس کے لئے ایک باب مخصوص کیا گیا ہے جس پر دلالت کرنے والی چند احادیث درج ذیل ہیں۔

۱۔ محمد خزاز ابو عبداللہ علیہ السلام سے ناقل ہیں۔ "حضرت علیہ السلام نے فرمایا" جو ہماری مرضی کے برخلاف ہمارے راز کو آشکار کرے وہ گویا ہمارے حق کا منکر ہے۔[1]

۲۔ ابن ابی یعفور کا بیان ہے کہ ابو عبداللہؑ نے فرمایا "جو ہمارا راز فاش کرے خدا اس کے ایمان کو سلب کر لیتا ہے۔

اس موضوع میں اس کے علاوہ بھی بہت سی روایات ہیں جن کی روشنی میں عقیدہ کو

۱۔ ج ۲۔ باب ۳۴۔ ابواب امر بالمعروف و نہی عن المنکر۔

۲۔ ۱۲۵ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

۳۔ ۳۰ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

چھپانا واجب ہے بلکہ بعض ایسے موارد میں اس کے برخلاف اظہار لازم ہے کہ جن کو نا اہلوں کے سامنے آشکار کرنے میں نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہو۔ یہ ایک طرح کا تقیہ ہے جس پر تقیہ کی تعریف صادق آتی ہے۔ مگر یہ پہلی دو قسموں میں داخل نہیں ہے۔

لیکن انصاف تو یہ ہے کہ اس قول کی ہمراہی ناممکن ہے۔ در اصل تقیہ کی اس قسم کا تعلق بھی پہلی قسم سے ہے جس کو تقیہ خوفی کہتے ہیں۔ سر اور راز کا اطلاق ایسے ہی موقع پر ہوتا ہے جہاں میں حق و حقیقت پر مبنی دینی عقائد کے کھل کر اظہار کرنے میں جانی، مالی، عرضی اور دینی اعتبار سے متضرر ہونے کا خوف ہو۔ اور اگر کسی مورد کے اظہار میں کوئی خوف نہ ہو تو اسے راز نہیں کہا جاتا۔ لہٰذا وہ "کتمان سر" کے عنوان کے تحت نہیں آئے گا......

چنانچہ اسی باب کی ایک سے زیادہ روایتیں ہماری بات کی تائید میں موجود ہیں۔

۱۔ یونس بن یعقوب اپنے واسطے سے ابو عبداللہؑ سے ناقل ہیں حضرتؑ نے فرمایا "ہمارا راز فاش کرنے والا ہمیں بر بنائے خطا قتل نہیں کرتا بلکہ عمداً قتل کرتا ہے۔[3]

یہ روایت صاف کہہ رہی ہے کہ راز فاش کرنا نہ صرف عظیم نقصان بلکہ قتل کا موجب بن سکتا ہے بلکہ فاش کرنے والا اس جرم سے گویا وہ قاتل کہا جائے گا.......... کیا یہ تقیہ خوفی کے زمرے کے مصادیق میں سے نہیں ہے؟ جب کہ آپ کو معلوم ہے کہ خوف کا تعلق اپنے ہی نفس سے نہیں بلکہ غیر سے بھی ہے۔

۲۔ دوسری روایت محمد ابن مسلم سے ہے۔ کہتے ہیں میں نے امام محمد باقر علیہ السلام کو فرماتے ہوئے سنا۔ "قیامت کے دن ایک شخص کو اٹھایا جائے گا اور ایک...... کی مقدار اس سے زیادہ خون اس کو دینے کے بعد کہا جائے گا کہ یہ فلاں شخص کا خون ہے جس کے قتل میں تو بھی شریک تھا۔"

عرض کرے گا پروردگارا! تو خوب جانتا ہے کہ جب تو نے مجھے دنیا سے

احتیاط تھا اس وقت تک میں نے کسی کا خون نہیں بہایا۔" خدا اسے گی؟ ہاں لیکن تجھے یہ علم جب اس شخص نے مجھ سے پہلا راز بیان کیا تو نے اس راز کی حفاظت نہیں کی اور اسے فاش کر دیا۔ غلط ظالم شخص کو اس کی خبر ہو گئی اور اس ظالم نے اس شخص کو قتل کر دیا اس طرح تو اس کے قتل میں شریک ہوا۔ لہٰذا اس کے قتل میں یہ تیرا حصہ ہے!

ظاہر ترک تقیہ کی وہ قسم نہیں ہے جس کی بنا پر دوسرا ہلاکت کا شکار ہوتا ہے

۳۔ اسحاق بن عمار کا بیان ہے کہ حضرت ابو عبداللہ نے درج ذیل آیہ کریمہ کی تلاوت کے بعد فرمایا۔ "ذالک بانہم کانوا یکفرون بآیات اللہ ویقتلون النبیین بغیر الحق ذالک بما عصوا وکانوا یعتدون" خدا کی قسم انھوں نے اپنے ہاتھوں اور تلواروں سے نبیوں کو قتل نہیں کیا بلکہ ان کے رازوں کو فاش کیا جس کے نتیجہ میں وہ پکڑے گئے اور انھیں ظلم و معصیت کا نشانہ بنا کر قتل کر دیا گیا۔

ان کے علاوہ اس مضمون کی بہت سی روایات ایسی ہیں جو اس امر پر دلالت کرتی ہیں کہ راز کا تعلق ایسے حقائق سے ہے کہ جن کا فاش کر دینا عظیم نقصان کا باعث بن سکتا ہے لہٰذا اس راز کو نقل کرنا تقیہ کے منافی ہے چونکہ اس سے اپنی یا دوسرے کی جان کا خطرہ لاحق ہو جاتا ہے

پس ان روایات کے مضمون سے بخوبی روشن ہو جاتا ہے کہ یہ تقیہ کی تیسری قسم نہیں ہے بلکہ ان ہی دو قسموں میں شامل ہے۔

ضمیمہ

مبحث التقیہ

ان جاءکم فاسق بنبأ فتبینوا

"النجم" لکھنؤ نسبت جلد ۱۲ اشاعت ۲۱ محرم ۱۳۴۳ھ میں الثانی من الماتین کے عنوان سے ایک مضمون لکھا گیا ہے جس کے رد کرنے کا سہیل بعنایت الٰہی ذمہ دار ہوا اسلئے آج یہ مبحث کسی قدر تفصیل کے ساتھ لکھا جاتا ہے ناظرین کرام سے امید ہے کہ وہ اسکے ایک ایک حرف پر نہایت غور و فکر سے نظر ڈالیں گے تاکہ کسی کاذب کے اخبار و کلمات کے فریب ہی کا موقع نہ آنے پائے وہو ہذا

"النجم" غالباً اس امر کے بیان کرنے کی ضرورت نہیں ہے کہ جھوٹ ایک ایسی بری نجاست ہے جسکو دنیا میں آج تک کسی انسان نے اچھا نہیں سمجھا اہل مذہب اور لامذہب سبھی اس سے نفرت کرتے ہیں حتی کہ بت پرست بھی اسکو نہایت برا جانتے ہیں جھوٹ بولنا سب کے نزدیک نہایت ذلیل کام ہے بقول سعدی "سہ دروغ اے برادر مگو زینہار کہ کاذب بود خوار و بے اعتبار"

سہیل۔ بے شک ایسا ہی ہے لیکن دنیا اس مطلب کو کہہ سکتی ہے صرف شاعر و اس مطلب کو نہیں کہہ سکتا کیونکہ اسکے نزدیک عقل کیلئے کوئی حکم ہی نہیں تجویز کیا گیا جو کچھ ہے وہ نقل ہے اور وہ امر جسمیں لامذہب بھی شریک ہو سکتا ہے وہ وہی ہے جسکی بنیاد عقل کے حکم پر واقع ہوئی ہے ورنہ اسکو آپ کی نقل سے کیا مطلب اور جب یہ ہے تو تم بھی خیال کرکے چپ ہو جاؤ کہ یہ وہ حکم ہے جو منقول ہے تم کو عقل سے کیا غرض اور تمہارے مذہب نے تمہیں اس قابل کہاں رکھا ہے کہ عقل سے کام لے سکو۔ پھر تمہیں یہ بھی خیال کرنا چاہیے کہ ایسی بات نہ کہو جو تمہارے مذہب کی ادھم ہو کیونکہ جھوٹ کے سوا اور کوئی چیز تمہاری نصرت نہیں کر سکتی جیسا کہ ہم اس مضمون میں آئندہ اس مطلب کے چہرہ سے پردہ ہٹائیں گے مدیر چونکہ اپنے مذہب کے داستوں سے ناواقف ہے اور وہ اس مطلب کو نہیں جانتا کہ انکے مذہب کے بڑے سے بڑے عالموں نے کذب صریح کی اجازت دی رکھی ہی نہیں تو وہ کیوں خلاف کذب پر کمر باندھنا چاہتا ہے جیسے "النجم" جن لوگوں کے پاس جاتا ہے اگرچہ انہیں سے

اخر تو مدیر ہی کی طرح مذہب کے پابند ہیں لیکن بعض ایسے بھی ہیں جنکو تقدس کا طریقہ معلوم ہے اور وہ جانتے ہیں کہ اس طریقے کے نیچے کیا چیز مخفی ہے جسے مدیر کو اس امر کی طرف متوجہ کرتا ہوں کہ وہ شرح اشباہ و نظائر حموی کو بغور دیکھے تو اسے اس کتاب میں یہ عبارت نظر آئیگی۔

فی شرح العینی للبخاری علی باب	خلاصہ ترجمہ کلام یہ ہے کہ شرح عینی جو صحیح بخاری کے متعلق ہے اس میں حدیث
شراء المملوک من الحربی وعتقہ	قتیبہ میں جہاں اور باتیں ہیں وہاں یہ بھی ہے کہ ظالم کے پنجے سے کسی چیز کے نکلنے
قتیبہ بن اللیث جیں سعد ما	کے لیے حیلے جائز ہیں اگر حیلہ بات کا علم ہو جائے کہ بغیر جھوٹ خلاصی ناممکن ہے
نصہ فیہ اتیا بالحدیث دلیل	تو جھوٹ بولنا بھی جائز ہوگا یا اتنا کہ کھلا ہوا سپید جھوٹ جائز ہو جائیگا اور
فی تخلیص من الظلمۃ اذا علم انہ	کبھی یہ صریحی جھوٹ اسوقت واجب ہو جائیگا اور یہ وجوب کذب ایسا ہے جسپر
لا یخلص الا بالکذب جاز الکذب	کل علما کا اتفاق ہے) جب اس جھوٹ سے کسی نبی کی نجات ہوتی ہو یا کسی ولی
ابیح وقد یجب بعض العقود	کی خلاصی ہوتی ہو اور وہ دست ظالم سے جو اسکی قتل کا ارادہ رکھتا ہو رہا ہو سکے
بالاتفاق کلو هرب نبیا او ولیا	یا اور مسلمان جانے اپنے دشمنوں سے اس جھوٹ کی وجہ سے بچ سکتی ہوں تو
مختفیا یقتلہ ونجاۃ المسلمین من	ہر حالت میں یہ سپید جھوٹ بولنا واجب ہو جائیگا اور فقہائے اسلام نے لکھا
عدوهم بقتال الضعفاء او طلب	کہ اگر کوئی ظالم کسی انسان کی امانت کسی سے غصب کرنے کیلیے مانگے تو اس شخص پر
ظالم ودیعۃ الانسان لیاخذها	واجب ہوگا کہ وہ جھوٹ بولے اور اس امانت کے وجود کا انکار کر دے اور یہ کہدے کہ مجھے
غصبا وجب الانکار والکذب فی	اس امانت کا مقام معلوم نہیں انتہی۔
انہ لا یعلم موضعها انتہی۔	

کیوں جناب مدیر صاحب یہ عبارت آپ کے اساطین مذہب کی نظر اقدس سے گزری تھی یا نہیں اگر نہیں گزری تو بندہ نے نظر مبارک کے سامنے پیش کر دی صرف جھوٹ بولنے کا جواز ہی اس میں نہیں ہے بلکہ وجوب کذب صریح بھی مذکور ہے۔ پھر ابتو جناب اپنی عبادتیں اس قول کے سامنے دوہرا دیجے کہئے کہ یہی کہدیجئے کہ تف ہے ایسے مذہب پر جس میں جھوٹ بولنا جائز ہی نہیں بلکہ واجب سمجھا گیا حضرت ابوبکر نے جو حدیث سیدہ سے فدک کے حاصل کرنے کیلیے سنائی تھی وہ اسی حیلہ پر تو نہ تھی

نہیں تھی ممکن ہے کہ ایسا ذرا شہزادہ اہلبیت کو ظلم میں سے خیال کیا ہو اور فدک کا لینا کسی حیلہ سے واجب سمجھا ہو اور کذب صریح کے قائل ہو گئے ہوں تو اسوقت انکی نظر میں ایسی حدیث کا گھڑ دینا واجب ہو گیا ہو تو پھر ایسی حدیث کا کیا اعتبار ہو سکتا ہے اور مجھے ایسا کہنے کا موقع اسلیے زیادہ ملا کہ حضرت ابوبکر نے جناب سیدہ صلوات اللہ وسلامہ علیہا کی تکذیب بھی ضرور کی ہے انہوں نے میراث پدر کا دعوی کیا ہو یا ہبہ فدک کا دعوی کیا ہو دونوں صورتوں میں تکذیب ضرور کی اور جسکی تکذیب صحیح ہو اسکا ظالم ہونا صحیح ہے کم سے کم اپنے نفس کا ظالم ایسا شخص ضرور ہوگا پھر کیا دلیل اس بات پر ہو سکتی ہے کہ انہوں نے کذب صریح کا ارتکاب نہیں کیا۔ یہ بھی فتاوی قاضی خان میں مرقوم ہے۔

رجل دعاہ الامیر فیسئل عن اشیاء ان	خلاصہ ترجمہ یہ ہے کہ کسی مرد کو امیر فرمانروا نے اسلیے بلایا کہ اس سے
تکلم بما یوافق الشرع یصیبہ مکروہ	چند چیزوں کو پوچھے اگر یہ شخص موافق شرع جواب دے تو اسکو کوئی تکلیف
فانہ لا ینبغی ان یتکلم بما یخالف الحق	صدمہ ہوگا ایسے شخص کیلیے یہ امر سزاوار نہیں کہ وہ مخالف شرع
ہذا اذا کان لا یخاف القتل علی نفسہ ولا	کوئی بات کہے یہ جبھی ہے جب اسے اپنے قتل ہو جانے یا اپنے کسی عضو کے
اتلاف عضوہ ولا یخاف علی مالہ فان	تلف ہو جانے کا اندیشہ نہ ہو اور نہ اپنے مال کا خوف ہو لیکن اگر جان مال
خاف ذلک فانہ لا باس۔	کا خوف ہو یا کسی عضو کے ضایع ہو جانے کا خطرہ ہو تو پھر شرع کے خلاف
	کہدینے میں کوئی مضائقہ نہیں۔

فتاوی قاضی خان چھپا ہوا ہر جگہ ملتا ہے ملاحظہ ہو جھوٹ بولنا تو خیر جیسا ہے ویسا ہے لیکن شرع کے خلاف کہنے کی اجازت جناب کے مذہب میں موجود ہے جس سے بالاتر کوئی جھوٹ ہو نہیں سکتا پھر اب اپنے مذہب کے متعلق جناب کا کیا فتوی ہے۔

اب یہاں ایک نظر فتح الباری پر بھی جناب کو ڈالنا چاہیے وہاں ابن حجر نے یہ قول نقل کیا ہے

قال ابن بطال تبعا لابن	یعنی ابن بطال نے ابن المنذر کے اجماع کی حجت سے کہا ہے کہ تمام فقہائے اسلام کا
المنذر اجمعوا علی ان من اکرہ	اس بات پر اتفاق و اجماع ہے کہ جس شخص کو کفر پر مجبور کیا جائے یہاں تک کہ
علی الکفر حتی خشی علی نفسہ	اسے قتل ہو جانیکا خوف ہو اس حالت میں وہ کلمہ کفر کہہ دے تو خدا کی ایک اسکا دل

الفتل بالكفر قلبه مطمئن بالايمان
فهذا الحكم عليه بالكفر والتبرئ منه
وزوجته الا محمد بن الحسن فقال بعد
اظهار الكفر صار مرتدا وبانت منه امرأته
وان كان في الباطن مسلما فقال
هذا قول يحكى عن الحليمي الفقيه

ایمان سے مطمئن ہو تو بھی ہرگز کافر ہونے کا حکم نہ کیا جائیگا اور نہ اسکی
زوجہ اس سے علیحدہ ہوگی اور حضرت محمد بن حسن نے اس اظہار کی بابت
کہا ہے کہ اظہار کفر کرنے والا مرتد ہو جائیگا اور اسکی زوجہ اس سے
علیحدہ ہو جائیگی اگرچہ وہ باطن میں مسلمان ہی کیوں نہ ہو یہ ایک ایسا قول
ہے کہ اسکا نقل ہی کر دینا کافی ہے رد کرنیکی ضرورت نہیں ہے کیونکہ ظاہر ہے
کہ یہ قول قطعی دلیلوں کے مخالف ہے۔

ابتک میری اس بات کا رونا تھا کہ وہ لوگ جھوٹ بولنے کو جائز کیے دیتے ہیں اب تو قابل انکے افسوس نہیں
کیونکہ کفر کے اظہار کا بھی فتویٰ انکے مذہب میں مل گیا۔ جب میں یہاں تک تحریر کر چکا تو اب جا بجا
تحریر کے چھپانے ہونیکا موقع ہو رہا ہے۔

"تمام مذہب میں جھوٹ بولنا اعلیٰ ترین عبادت قرار دیا گیا ہو اس مذہب کے باطل
ہونے میں کس کو شک ہو سکتا ہے اور اس مذہب کے لوگ اگر کسی بات کی خبر دیں کوئی بات
بیان کریں یا تفسیر کریں ان کا اعتبار کر سکتے ہیں ؟"

اسی وجہ سے حضرت عثمانؓ کی بات کا اعتبار مدینہ کے صحابیوں نے کیا نہ اہل مصر نے کیونکہ پہلی مرتبہ
انھوں نے توبہ کی کہ اب ایسی حرکات نہ کرونگا تو اہل مصر پلٹ گئے کہ شاید اب یہ ایسی حرکتیں نہ کریں
انکو کیا معلوم تھا کہ اظہار توبہ فقط لوگوں کے واپس کر دینے کیلئے ہے حقیقت میں وہ کوئی چیز نہیں ہے
چنانچہ مورخ طبری اور دیگر مورخین قصہ لائے ہیں مگر یہاں صرف طبری کی روایت کو نقل کرتا ہوں جو
عبرت کیلئے کافی ہے۔

وكتب عثمان الى عبد الله بن سعد
بن ابي سرح عامله على مصر حين تراجع
الناس عنه وزعم انه تائب بكتاب
في الذين شخصوا من مصر وكان في

ملخص ترجمہ یہ ہوا کہ حضرت عثمان نے اپنے عامل عبد اللہ بن سعد بن
ابی سرح کو جو مصر کا فرمانروا تھا لکھا اس وقت جب مصر کے لوگ مطلق
ہوکر مدینے سے مصر کی جانب پلٹ رہے تھے اور یہ خیال کر لیا گیا تھا کہ
حضرت عثمان نے توبہ کرلی اب وہ آئندہ اپنی معمولی حرکتوں سے باز رہینگے)

اشد اهل الامصار عليه اما بعد
فانظر فلانا وفلانا فاضرب
اعناقهم اذا قدموا عليك فانظر
فلانا وفلانا فعاقبهم بكذا وكذا
منهم نفر من اصحاب رسول الله
صلى الله عليه وسلم ومنهم قوم من
التابعين فكان رسوله في
ذلك ابو الاعور بن سفيان
السلمي حمله عثمان على جمل له فاتى
له اهل مصر كتاب فقال لا
قالوا فيم ارسلت قال لاحمل الي يا
ليس معك كتاب قال لا قال
ارسلت الى امر لم يب ففتشوه
فوجدوا معه كتابا الى عامله
فنظروا في الكتاب فعادوه فيه قتل
بعضهم وعقوبة بعضهم في انفسهم
واموالهم فلما رأوا ذلك رجعوا
الى المدينة فبلغ الناس رجوعهم
والذي كان من امرهم فتحركوا
الافاق كلها وثاروا اهل
المدينة۔

خط میں مضمون یہ تھا کہ اما بعد فلاں اور فلاں اہل مصر کو دیکھنا انکو قتل کر دینا
جب وہ وہاں مصر میں تجھ تک پہونچ جائیں اور فلاں فلاں کو یہ سزا دینا اور
یہ سزا دینا انمیں سے کچھ لوگ رسول اللہ کے صحابی تھے اور بعض لوگ انمیں
تابعین میں سے تھے یہ نامہ لیکر حضرت عثمان نے ابوالاعور بن سفیان سلمی کو روانہ
کیا اپنے اونٹ پر اسکو سوار کرکے حکم دیا کہ مصر جائے اور اتنی تعجیل سے جائے کہ وہ
لوگ جو مصر پلٹ کر جا رہے ہیں مصر جب نہ پہونچنے پائیں اتفاق کی بات کہ
راہ ہی کسی حصہ میں ابوالاعور سے ان لوگوں سے (جنکے باب میں سزا کی
تجویز کی گئی تھیں) مڈ بھیڑ ہو گئی ان لوگوں نے ابوالاعور سے پوچھا کہ کہاں
جاتے ہو اس نے کہا مصر جاتا ہوں ابوالاعور کے ساتھ ایک شامی بھی ہو رہا تھا
جو تھا لیکن ابوالاعور کو حضرت عثمان کے اونٹ پر دیکھکر ان لوگوں نے
پوچھا کہ کوئی خط تمہارے ساتھ ہے ابوالاعور نے کہا نہیں کوئی خط میرے ساتھ
نہیں انھوں نے کہا آخر کس کام کیلئے بھیجے گئے ہو ابوالاعور نے جواب دیا کہ
مجھے معلوم نہیں تب انھوں نے کہا کہ تیرے پاس خط ہے اور تجھے اس بات کا
علم ہے کہ تو کس کام کیلئے بھیجا گیا ہے تیرا معاملہ تو شک پیدا کرتا ہے پھر
انھوں نے ابوالاعور کی تلاشی لینی شروع کردی تو ایک خط اسکے
برتن میں انکو ایک خط ملا خط کو کھولا کھول کر پڑھا تو انہیں نظر آیا کہ انمیں
سے بعض کے قتل کا حکم ہے بعضوں کیلئے مال کے ضبط کی سزا تجویز کی گئی ہے بعضوں
کے لیے جان کی سزا مرقوم ہے جب ان چیزوں کو ان لوگوں نے (یہ حال) دیکھا
تو وہ مدینہ کی طرف پھر پلٹ پڑے لوگوں کو خبر معلوم ہوئی کہ وہ لوگ
پلٹ آئے اور جو راہ میں قصہ گذرا تھا اسکی خبر بھی پھیلی تو سب لوگ
ہر افق سے چلے اور مدینہ والوں میں پھر جوش پیدا ہوگیا۔

پھر اسکے بعد بھی طبری نے یہ روایت لکھی ہے۔

حدثني جعفر قال حدثنا عمرو وعلي
قالا حدثنا حسين عن ابيه عن محمد بن
السائب الكلبي قال انما رد اهل مصر
الى عثمان بعد انصرافهم عنه انه ادركهم
غلام لعثمان على جمل له بصحيفة الى امير مصر
ان يقتل بعضهم وان يصلب بعضهم فلما
اتوا عثمان قالوا هذا غلامك قال غلامي
انطلق بغير علمي قالوا جملك قال اخذه من الدار
بغير امري قالوا فخاتمك قال نقش عليه

سند مذکور سے سائب کلبی سے روایت ہے انہوں نے بیان کیا کہ اہل مصر
عثمان سے پلٹ کر پھر اسلئے پلٹ آئے کہ انہوں نے راہ میں عثمان کے غلام
کو عثمان کے اونٹ پر عثمان کے خط سمیت پایا جس میں بعض لوگوں کیلئے
سزائے موت تلوار کے ذریعے سے تجویز کی گئی تھی اور بعضوں کی
سزائے موت سولی کے ذریعے سے تجویز کی گئی تھی جب وہ عثمان کے پاس
آئے تو انہوں نے پوچھا کہ یہ تمہارا ہی غلام ہے تو کہا میرا غلام بغیر
میرے علم کے چلا گیا پھر لوگوں نے پوچھا کہ یہ تمہارا ہی اونٹ ہے نا؟
کہا اسے میرا اونٹ بغیر میری اجازت کے میرے گھر سے لیا گیا کہ یہ
انگشتری تمہاری ہی مہر ہے نا؟ کہا اسے کاغذ پر مہر کر لی

آپ ملاحظہ فرمایئے کہ کتنی جھوٹ پھر ارشاد کا انکار خط میں جھوٹ پھر حضرت عثمان کے [illegible]
غلام کے جانے میں اونٹ کے لینے میں مہر کے کرنے میں۔ آخر آپ اسے دروغ کہتے ہیں یا تیب کچھ فرمایئے
حضرت عثمان کے حالات ہیں جو منجملہ خلفائے راشدین ہیں کوئی معمولی آدمی نہیں ہے اور اگر
اس سے مفصل روایت دیکھنا ہو تو وہ بھی حاضر ہے جو اسی کتاب میں ان الفاظ کے ساتھ موجود ہے۔

حدثني جعفر قال حدثنا عمرو وعلي
قالا حدثنا حسين عن ابيه عن
محمد بن اسحق ابن يسار المدني
عن يحيى بن عباد عن عبد الله
بن الزبير عن ابيه قال كتب
اهل مصر بالسقيا او بذي خشب
الى عثمان بكتاب فجاء به رجل

مخلص کلام زبان اردو میں یہ ہے کہ بسند مذکور زبیر ابن العوام سے روایت
ہے کہ مصر والوں نے مقام سقیا یا ذی خشب سے عثمان کو ایک خط لکھا اس خط کو
انہیں میں کا ایک آدمی لیکر عثمان پاس آیا، حضرت عثمان نے خط تو دیکھ لیا
لیکن اسکا کوئی جواب نہ دیا اور حکم دیا کہ اس نامہ بر کو گھر سے نکال دو
حسب الحکم نکال دیا گیا وہ تمام مصری لوگ جو عثمان کا ارادہ کرکے گئے تھے
انکی تعداد چھ سو تھی اس تمام جماعت میں چار علم تھے اور چار سردار تھے
ہر سردار پاس ایک ایک جھنڈا تھا اور تمام سرداری لشکر کی انتہا عمرو بن

منهم حتى دخل به عليه فلم يرد
عليه شيئا فامر به فاخرج من
الدار وكان اهل مصر الذين
ساروا الى عثمان ستمائة رجل
على اربعة الوية لها رؤس
اربعة مع كل رجل منهم لواء
وكان جماع امرهم جميعا الى عمرو
بن بديل بن ورقاء الخزاعي
وكان من اصحاب النبي صلى الله
عليه وسلم والى عبد الرحمن
بن عديس التجيبي فكان فيما
كتبوا اليه بسم الله الرحمن الرحيم
اما بعد فاعلم ان الله لا يغير ما بقوم
حتى يغيروا ما بانفسهم فالله
الله ثم الله الله فانك على
دنيا فاستتم اليها معها آخرة
ولا تنس نصيبك من الآخرة
فلا تسوغ لك الدنيا واعلم
انا والله لله نغضب وفي الله
نرضى وانا لن نضع سيوفنا
عن عواتقنا حتى تاتينا منك

بدیل بن ورقاء الخزاعی اور عبدالرحمن بن عدیس کی جانب تھے اور عمرو بن بدیل
جناب رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب میں سے تھے ان لوگوں نے
جو خط لکھا تھا اسکا یہ مضمون تھا۔ بسم اللہ کے بعد لکھا تھا کہ تمہیں معلوم رہنا چاہیے
کہ خدا کسی قوم کی حالت کو نہیں بدلتا جب تک کہ وہ خود اپنے حالات میں تغیر و تبدل
نہ کریں دیکھو خدا سے ڈرو خدا سے ڈرو پھر ہم کہتے ہیں کہ خدا سے ڈرو خدا سے
ڈرو کیونکہ تم دنیا میں ہو آخرت کو بھی اسکے ساتھ ملا دو اور اپنے آخرت کے حصہ کو
بھولو نہیں ورنہ دنیا بھی تمہارے لئے گوارا نہ ہوگی اور یہ بھی جانے رہو کہ خدا کی
قسم ہم خدا ہی کیلئے غضبناک ہوتے ہیں اور خدا ہی کیلئے راضی ہوتے ہیں اور
ہم اپنی تلواروں کو اپنے کاندھوں سے اس وقت تک نہ اتاریں گے جب تک
ان دو باتوں میں سے ایک معلوم نہ ہو جائے یا تو یہ معلوم ہو جائے کہ تم نے اپنی
باتوں سے صریحی توبہ کر لی اور جیسا کرتے تھے ویسا نہ کرو گے یا یہ معلوم ہو جائے
کہ تم اپنی گمراہی کو کسی طرح نہ چھوڑو گے (غرض جو بات ہو ہمیں صاف صاف
معلوم ہو جانا چاہیے) یہ ہمارا قول ہے اور یہی ہمارا فیصلہ ہے اور خدا ہمارا
عذر تمہارے باب میں قبول کریگا۔ والسلام۔ ادھر تو مصر والوں نے یوں لکھا
اور ادھر مدینہ والوں نے عثمان سے [illegible] جبش کی اور [illegible]
قسم کھائی کہ وہ انہیں کسی طرح نہ چھوڑیں گے جب تک کہ عثمان [illegible]
مرادیں [illegible] ورنہ وہ انہیں قتل کر دیں گے [illegible]
جنگ کی گئی اور کوئی جان کا خوف ہوا تو [illegible] اور
مخلصوں سے مشورہ کیا [illegible]
بھی شریک کر لیا ان لوگوں سے عثمان نے گفتگو شروع کی کہ جو کچھ لوگ
کر رہے ہیں وہ تم نے دیکھی اور دیکھ رہے ہو [illegible] کیا ہے اور ان باتوں

[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
القوم ما قد اتيتم [illegible] فاشاروا
اليه ان يرسل الى علي بن ابي طالب
فيطلب اليه ان يردهم عنه ويعطيهم
ما يرضيهم ليطاولهم حتى ياتيه امداده
فقال ان القوم لن يقبلوا التعليل
وهي محملي عهدا وقد كان مني في قدمتهم
الاولى ما كان فمتى اعطهم ذلك يسألوني
الوفاء به فقال مروان بن الحكم
يا امير المؤمنين مقاربتهم حتى تقوى
امثل من مكاثرتهم على القرب فاعطهم
ما سألوك وطاولهم ما طاولوك
فانما هم بغوا عليك فلا عهد لهم فارسل
الى علي فدعاه فلما جاءه قال يا ابا حسن

خلاصی کیونکر ممکن ہے سب نے اس بات کا مشورہ دیا کہ حضرت علی بن ابی طالب کو
بلوائیے اور ان سے اس بات کی خواہش کیجئے کہ وہ لوگوں کو آپ سے باز رکھیں
اور وہ ان لوگوں سے انکی مرضی کے موافق وعدہ کر کے انکو ٹال دیں یہاں تک
کہ آپکے اعوان و انصار جمع ہو جائیں حضرت عثمان نے فرمایا کہ اب وہ وقت
نہیں رہا کہ لوگ لیت و لعل سے راضی ہو جائیں اور میرا عہد و پیمان انکی
نظر میں کمزور ہے چنانچہ جب یہ لوگ آئے تھے تو ایسا ہی کچھ کیا گیا تھا اگر
میں عہد و پیمان کر کے ان سے وعدہ کروں گا تو یہ لوگ مجھ سے وفائے عہد کا
تقاضا کریں گے۔ مروان بن حکم نے کہا یا امیر المومنین ان کے موافق رفتار کرنا یہاں تک
کہ آپکو قوت حاصل ہو اس امر سے بہتر ہے کہ وہ لوگ قریب ہو کر زیادہ ہو تے
جائیں لہذا مناسب ہے کہ جس بات کو یہ لوگ مانگیں وہ انکے موافق دیجائے
اور انکو اس وقت تک ٹالنا چاہیے جب تک وہ ٹل سکیں کیونکہ یہ لوگ باغی ہیں
اور باغیوں سے عہد کی وفا کیسی جب یہ رائے قرار پائی تو عثمان نے حضرت علی کو
بلا بھیجا جب آپ تشریف لائے تو عثمان نے یوں کہنا شروع کیا آپ دیکھتے ہیں کہ
ان لوگوں نے میرے ساتھ کیا سلوک کیا ہے اور یہ بھی آپکے علم میں ہے
کہ میں نے ان کے ساتھ کیا کیا اور اب مجھے اپنے قتل ہونے سے اطمینان نہیں ہے
لہذا ان کو کسی طرح واپس کر دیجئے کیونکہ میں خدا کو ضامن دیتا ہوں کہ میں
ہر چیز کو جو انکو ناپسند ہے چھوڑ کر انکو خوش کر دوں گا اور حق انکو دے دوں گا
چاہے وہ میرے نفس سے متعلق ہو یا میرے غیر سے متعلق ہو اگرچہ اس میں میرا خون گرایا جائے
چاہے میری جان جاتی رہے حضرت امیر المومنین نے جواب میں فرمایا کہ لوگوں کو
آپکے قتل کرنے کی ضرورت نہیں ہے بلکہ آپ کی عدل و داد کی ضرورت ہے
اور مجھے تو یہی دکھلائی دیتا ہے کہ یہ لوگ جب تک کہ ان کی مرضی کے موافق کام

وقد كان من الناس ما قد رأيت
وكان مني ما قد علمت ولست آمنهم
على قتلي فارددهم عني فان لهم الله
عز وجل ان اعتبهم من كل ما يكرهون
وان اعطيهم الحق من نفسي ومن
غيري وان كان في ذلك سفك دمي
فقال له علي الناس الى عدلك
احوج منهم الى قتلك واني لأرى
قوما لا يرضون الا بالرضا وقد كنت
اعطيتهم في قدمتهم الاولى عهدا من الله
عن جميع ما نقموا فرددتهم
عنك ثم لم تف لهم بشيء من ذلك
فلا تغررني هذه المرة من شيء فاني معطيهم
عليك الحق قال نعم فاعطهم فوالله
لافين لهم فخرج علي الى الناس فقال
ايها الناس انكم انما طلبتم الحق فقد
اعطيتموه ان عثمان قد زعم انه
منصفكم من نفسه ومن غيره وراجع
عن جميع ما تكرهون فاقبلوا منه
ووكدوا عليه قال الناس قد قبلنا
فاستوثق منه لنا فانا [illegible]

نہ کیا جائیگا راضی نہ ہونگے اور تم نے پہلی بار جب یہ لوگ آئے تھے تو ضمانت عہد کیا تھا
کہ تم ان باتوں کو ترک کر دو گے جن سے ان لوگوں کو بیزاری ہے اور اسی بنا پر تم نے
ان لوگوں کو پلٹا دیا تھا مگر تم نے اپنے عہدوں پر وفا نہ کی اب اس مرتبہ مجھ کو
دھوکا نہ دیجئے کیونکہ میں تمہاری طرف سے انکا حق مقرر و ادا کرونگا حضرت عثمان نے کہا ہاں
آپ انکو حق مقرر و ادا کیجئے اور خدا کی قسم میں بیشک انکے ساتھ وفا کرونگا
جب امیر المومنین علی نے یہ سنا تو آپ ان لوگوں کے پاس تشریف لائے اور
فرمایا اے لوگو تم تو صرف طالب حق ہو اور حق ہی مانگتے ہو وہ تمہیں
دیا گیا کیونکہ عثمان کا خیال ہے کہ وہ تمہارے ساتھ انصاف کریگا چاہے وہ
انکے نفس سے متعلق ہو یا انکے غیر سے اور تمام ان باتوں کو چھوڑ دینگے
جو تمہیں ناپسند ہیں بہتر ہے کہ تم ان کی باتوں کو قبول کر لو اور ان سے عہد مضبوط کر لو
لوگوں نے کہا ہمیں منظور ہے مگر آپ ان سے ہمارے لئے عہد کرا دیجئے کیونکہ
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

الذي (؟) ... فقال لهم
حتى ذلك كلم ثم دخل عليه فأخبره الخبر
فقال عثمان اضرب بيني وبينهم أجلاً
يكون لي فيه مهلة فإني لا أقدر على رد ما
كرهوا في يوم واحد فقال له علي ما حضر
بالمدينة فلا أجل فيه وما غاب فأجله
وصول أمرك قال نعم ولكن أجلني فيما
بالمدينة ثلاثة أيام قال علي نعم فخرج إلى
الناس فأخبرهم بذلك وكتب بينهم
وبين عثمان كتاباً وأجله فيه ثلاثاً على أن
يرد كل مظلمة ويعزل كل عامل كرهوه
ثم أخذ عليه في الكتاب أعظم ما أخذ الله
على أحد من خلقه من عهد وميثاق
وأشهد عليه ناساً من وجوه المهاجرين
والأنصار فكف المسلمون عنه و
رجعوا إلى أن يفي لهم بما أعطاهم من نفسه
فجعل يتأهب للقتال ويستعد
بالسلاح وقد كان اتخذ جنداً عظيماً
من رقيق الخمس فلما مضت الأيام
الثلاثة وهو على حاله لم يغير شيئاً
مما كرهوه ولم يعزل عاملاً ثار به

اچھا جو مناسب سمجھے آپ لوگوں پاس تشریف لے گئے اور انہی سے یہ تمام حالات
بیان کر دیئے اور آپ نے لوگوں کے درمیان میں اور عثمان کے درمیان میں ایک تحریر
لکھی جس میں عثمان کو تین دن کی مہلت دی گئی اس امر کے لیے کہ ہر ظلم کو دور
کر دیں گے اور ہر عامل کو جو قوم کی ناخوشی کا موجب ہو معزول کر دیں گے پھر عثمان پر
بڑے سے بڑا عہد و میثاق جو خدا نے اپنے کسی بندے سے لیا ہو تحریر کیا گیا
اور تمام مہاجرین و انصار کی اس پر گواہیاں لکھی گئیں اس عہد نامہ کی تحریر کے
بعد لوگوں نے حضرت عثمان سے دست کشی کی اور اس وقت تک کے لیے جب تک
وہ اس عہد پر وفا کریں لوگ چلے گئے۔ اور ادھر تو وہ لوگ چلے ادھر حضرت
عثمان نے جنگ کیلئے تیاری شروع کر دی اور سامان جنگ مہیا کرنا شروع
کر دیا خمس کے حق میں جو غلام فراہم ہوئے تھے ان سے ایک بڑا لشکر
بنایا جب مہلت کے تینوں دن گزر گئے اور حضرت عثمان اپنے حالات پر ثابت
قدم رہے نہ کوئی عہد انجام کیا نہ کسی عامل کو معزول کیا تو اب لوگوں میں
سخت جوش پیدا ہو گیا اور عمرو بن حزم انصاری نے مقام ذی خشب میں
آ کر مصریوں کو صورت واقعہ سے اطلاع دی اور پھر مصری لوٹ کے
مدینہ واپس آئے ان لوگوں نے عثمان پاس یہ پیغام بھیجا کہ کیا ہم تمہارے
کہنے سے یہاں سے نہیں چلے گئے تھے کیا تم نے خدا سے عہد و پیمان نہیں کیا تھا کہ
ہم اپنے تمام کرتوت اور باتیں چھوڑ دیں گے عثمان نے کہلوا بھیجا کہ ہاں ایسا ضرور
ہوا تھا میں اسی عہد پر ہوں تب لوگوں نے کہا کہ اگر تم اسی عہد و پیمان پر
قائم ہو تو وہ خط کیسا تھا جو ہم نے تمہارے قاصد کے ساتھ پایا اور جس میں تم نے
عامل مصر کے نام لکھا تھا کہا کہ نہ میں نے وہ خط بھیجا ہے نہ مجھے اس خط کا کوئی علم
ہے لوگوں نے کہا کہ تمہارا قاصد تمہارے اونٹ پر اسی خط کو لیکر چلا جا رہا تھا

الناس فخرج عمرو بن حزم الأنصاري حتى أتى المصريين
وهم بذي خشب فأخبرهم الخبر وسار معهم حتى قدموا المدينة
فأرسلوا إلى عثمان ألم نفارقك على أنك زعمت أنك تائب
من أحداثك وراجع عما كرهنا منك وأعطيتنا على ذلك
عهد الله وميثاقه قال بلى أنا على ذلك قال فما هذا الكتاب
الذي وجدنا مع رسولك وكتبت به إلى عاملك قال ما فعلت
ولا لي علم بما تقولون قالوا بريدك على جملك وكتاب كاتبك
عليه خاتمك قال أما الجمل فمسروق وقد يشبه الخط الخط
وأما الخاتم فانتقش عليه قالوا فإنا لا نعجل عليك وإن كنا قد
اتهمناك اعزل عنا عمالك الفساق واستعمل علينا من لا يتهم
على دمائنا وأموالنا واردد علينا مظالمنا قال عثمان
ما أراني إذاً في شيء إن كنت أستعمل من هويتم وأعزل
من كرهتم الأمر إذاً أمركم۔

کاتب کے ہاتھ کا لکھا ہوا تھا اور مہر تمہاری مہر
موجود ہے اس صحیح و صریح عبارت کے جواب میں
حضرت عثمان نے بیان فرمایا کہ وہ شتر میرا چرا لیا گیا
ہے رہ گیا خط تو ممکن ہے کہ کسی کاتب نے جس کا
خط میرے کاتب کے خط کے مشابہ ہے یہ لکھا ہو کیونکہ
ایک خط دوسرے خط کے مشابہ ہو سکتا ہے رہ گئی مہر
سو ممکن ہے کہ وہ بنا لی گئی ہو لوگوں نے انکے جواب میں کہا
کہ اچھا ہم جلدی نہیں کرتے اگرچہ ان باتوں کا اتہام
قائم ہو چکا۔ پھر فاسق عاملوں کو معزول کر دو اور
ان لوگوں کو منصوب کرو جو ہماری جان و مال کی
حفاظت میں مشکوک نہ ہوں اور ہمارے مظالم کو
واپس دلاؤ۔ تو عثمان نے کہا کہ پھر میں تو کچھ رہا ہی
نہیں جب میں تمہاری مرضی کے موافق معزول و
نصب کروں۔

(اب دیکھئے) اب ہر ایک شمار کرے کہ کتنے جھوٹ استعمال کئے گئے اور صرف چند دن ہی سے نہیں
بلکہ خدا سے عہد کرکے پورے گئے بعض باتیں بالکل بلا ضرورت بولے گئے قتل کا اندیشہ اسی جھوٹ ہی
میں تھا صدق میں ہرگز نہ تھا لیکن پامردی اسکا نام ہے کہ عہد و میثاق سب توڑ دیکھئے رہے
لیکن حضرت خلافت مآب نے ہرگز سچ کو قابل عمل نہ سمجھا یہاں تک کہ انجام کار جو کچھ ہونا تھا وہ ہوا۔
اچھا اب آپ کیا فتویٰ دیتے ہیں کیونکہ یہ آپکے عوام کا فعل نہ تھا بلکہ ایک خلیفہ راشد کا فعل تھا
جسکی اطاعت بہر حال آپکو واجب ہے کیونکہ اصول ہی اس قسم کے مسلم ہو چکے ہیں جس سے آپ
مجبور ہیں پھر حضرت عثمان کے اس رویہ کو دیکھتے ہوئے آپ انکے کسی قول کا اعتبار فرما سکتے ہیں یا
اور پھر بقول آپکے دروغ بلا ضرورت بدترین قسم ہے اسکا ارتکاب کیا کیونکہ جان بچانے کیلئے

حکایت ساختہ میں سچائی کی ضرورت تھی نہ جھوٹ کی۔ چنانچہ آپ فرماتے ہیں اگر جھوٹ بولنے کو بوقت ضرورت شدیدہ جائز کہا جائے تو اس میں عقلاً اور عرفاً چنداں قباحت نہیں کیونکہ جائز ہی سمجھ سکتے ہیں جیسے کہ بعض ثواب بھی ضرور ہیں بلکہ جب جائز سے ترقی کر کے اسکو فرض و واجب کہا جائے اس کو عبادت کہا جائے تو عقل سلیم کبھی پسند نہیں کر سکتی۔

مدیر صاحب نے لفظ چنداں پر ایک حاشیہ بھی دیا ہے اسکے الفاظ یہ ہیں "یعنی عوام کے لیے بضرورت شدیدہ کے وقت میں جھوٹ بولنا معیوب نہیں خواص کے لیے اس وقت میں بھی معیوب ہے"

اس عبارت کو دیکھکر مجھے اس بات کا موقع ملتا ہے کہ حضرت عثمان جو مذہب اہلسنت کے رئیس ہیں وہ مدیر کے نظر میں عوام میں داخل تھے یا خواص میں، اگر عوام میں داخل تھے تو انکو بضرورت جھوٹ بولنا نظر مدیر میں جائز تھا مگر انھوں نے بلا ضرورت ارتکاب کذب فرمایا اور اگر وہ خواص میں سے تھے تو کسی طرح بھی انکو کذب جائز نہ تھا پھر جب آپکے رسالہ آپکے راویوں کی حکایت کی بنا پر اس جرم شنیع میں مبتلا ہوں تو آپ کسی مذہب والے کے ساتھ اس طرح کی بیجا تقریریں کیوں کرتے ہیں

ایک عجیب طرز استدلال

اس امر سے خوش ہوں کہ تقیہ پر ہنسنے والا اسکے جواز کو اس مضمون میں تجویز کرتا ہے وہ عوام ہی کیلیے سہی مگر خیر تقیہ اسکی نظر میں کوئی چیز تو ثابت ہوا اب وجوب کا کہنا اور تقیہ کا عبادت ہونا اسکا سمجھا دینا میرا کام ہے لہذا ناظرین میرے الفاظ کی طرف ہمہ تن گوش ہو جائیں اگر مدیر کی سمجھ میں میری باتیں نہ آئیں گی تو بہت سے انصاف پسند علماء جو مذہباً سنی ہوں یا شیعہ اطراف عالم میں موجود ہیں جو ہمارا انصاف دے سکتے ہیں۔

میں اپنے اس بیان میں ایک خاص شخص (جو اپنے کو بڑا مناظر اور بڑا متکلم سمجھتا ہے اور اسکے دل میں اس بات کی حسرت ہے کہ وہ حضرات اہلسنت میں رئیس مذہب تسلیم کیا جائے) کو مخاطب کرتا ہوں اور اسی سے اسوقت میرا مخاطبہ ہے "یعنی جناب مولوی عبدالشکور صاحب مدیر النجم"

اگر جناب کی پیدائش مقدم ہوتی اور تقدیر نے آپکو پیدا کر کے صبح شب ہجرت غار ثور کے کنارے کھڑا کر دیا ہوتا اور غار میں خلاصہ موجودات کا قیام ہوتا اور حضرت ابوبکر بھی اپنے حزن سمیت غار میں موجود

ہوتے اور آنحضرت کے دشمن اور جانثاران دشمن پیغمبر کو ڈھونڈتے ہوئے آتے اور آپ نے پیغمبر اور انکے رفیق اول کو غار میں جاتے ہوئے دیکھا ہوتا اور وہ آپ سے پوچھتے کہ تم بتاؤ غار میں محمد اور ان کی حمایت کرنے والا ہے یا نہیں اور اتفاقاً یہ کہ کبوتران صحرائی اپنی بود و باش سے قصداً وجود پیغمبر کو چھپاتے ہوتے اور کمزور مکڑی کا جالا دشمنوں کی آنکھ کا جالا ہو رہا تھا تو آپ دشمنوں کے سوال کے وقت کیا جواب دیتے پیغمبر کے غار میں ہونے کی تصدیق فرماتے یا کہتے کہ ہمنے نہیں دیکھا یا کہتے کہ مجھے معلوم نہیں اگر جناب اپنی سچائی کے دھن میں کہیں یہ کہدیتے کہ جی ہاں اسی غار میں ہیں پیغمبر بچشم خود جاتے ہوئے دیکھا ہے تو قتل پیغمبر کا بار آپکے سر مبارک پر ایک ناگوار صورت میں رہتا جو ہمیں اور عوام کے داغوں سے کہیں زیادہ بدنما ہوتا اور اگر آپ فرماتے کہ مجھے نہیں معلوم جب بھی آپ انکو تفتیش و تحقیق کا موقع دیتے ضرور آپکو یہ کہنا پڑتا کہ وہ اس غار میں نہیں ہیں تاکہ آپ کبوتر اور مکڑی سے کم نہ نکلیں اور اعداء خدا میں آپ کا شمار نہ ہو اور آپ اور دنیا کے عاقل کو یہ بات معلوم ہے کہ ایسا کہنا کہ اس غار میں نہیں ہیں کذب صریح ہوتا اور آپ اگر محبت خدا و رسول کی تھی تو اس ارتکاب سے بچ نہیں سکتے تھے اب فرمائیے کہ ایسے وقت میں یہ کذب صریح آپ پر واجب ہوتا یا جائز اگر آپ جائز فرمائیں گے تو سچے واقعات کا بیان کرنا بھی جائز ہو گا یعنی قتل رسول کا راستہ بتانا بھی جائز ہوتا اور اسکو جائز کہنا شاید آپ ہی کا کام ہے اگر آپ جرات کر سکیں تو کہیے۔ لیکن مجھے معلوم ہے کہ آپ تو کیا مدعیان اسلام کی کوئی فرد بھی اسوقت راست گوئی کو جائز نہیں کہہ سکتی پھر جب ایسے وقت میں راست گوئی حرام تھی تو دروغ گوئی واجب ہوئی یا نہیں اب اگر آپ اس مواخذہ سے بھاگ سکتے ہوں تو بھاگیے وارثت الحق۔ اور آپ عوام میں سے تو اپنے کو گنتے نہ ہونگے تاکہ انکے لیے تقیہ کا جواز تجویز کرتے آپ تو خواص میں سے ہیں اور آپ ہی پر تقیہ بد نصیبی سے واجب ہو جاتا پھر چونکہ آپ طرفداری خدا اور رسول کی ہوتی اسلیے جتنا بھی ثواب جناب باری سے مرحمت ہوتا وہ کم تھا کیونکہ آیۂ کریمہ قرآنیہ

من اجل ذلک کتبنا علی بنی اسرائیل انہ	اسی وجہ سے ہمنے بنی اسرائیل پر لکھدیا کہ جو کوئی شخص کسی نفس کو
من قتل نفسا بغیر نفس او فساد فی الارض	بغیر انتقام نفس یا بغیر کسی فساد ادمی کے قتل کر دے تو وہ

فکانما قتل الناس جمیعا ومن احیاہا فکانما احیا الناس جمیعا۔	ایسا ہے جیسے اس نے تمام بنی نوع انسان کو قتل کر دیا ہو اور جو شخص کسی نفس کو زندہ کرے وہ ایسا ہے جیسے اس نے تمام لوگوں کو زندہ کر دیا ہے

جب یہ فیصلہ معمولی نفوس کے متعلق خدا نے قرار دیا ہے تو خاتم المرسلین کے نفس مبارک کے بچاؤ کی ترکیب کر دینا کس قدر موجب اجر ہوتا اور کتنی بڑی عبادت ہوتی اچھی طرح سے یہ امر منکشف ہو گیا ہوگا کہ تقیہ کبھی واجب ہو جاتا ہے اور بڑی سے بڑی عبادت کی صورت میں ہوتا ہے جسکے ثواب کی کوئی انتہا متصور نہیں ہوتی۔ مگر مجھے امید نہیں کہ وہ جناب اس نکتہ مرتکز کو سمجھے کیونکہ اس نے اپنے آگے ان لوگوں کو کر رکھا ہے جنہوں نے کبھی قتل نبی کے سامنے لانے میں دریغ نہیں کیا چنانچہ میدان جنگ احد آیات قرآنی سمیت جو اس موقع کے عظیم القدر گواہ ہیں اس مطلب پر شاہد ہیں لوگ اطمینان سے آراستہ زرہ پہن کر وجنہ یا یمین نکل گئے اور ایک جماعت پہاڑ کی چوٹی پر اتنی بہادر رکے ہوئے اطمینان تمام بیٹھے رہے اور میدان جنگ میں پیغمبر عظیم مصیبت میں مبتلا تھا جسپر دندان مبارک کا شہید ہو جانا اور رخسار مبارک کا لہو سے رنگین ہو جانا ایک غیر قابل رد گواہ ہے۔ وہ جو شب ہجرت سپر ہو گیا تھا وہی احد کے پرہول میدان میں بھی سپر تھا جسکو مدیر نظام مہذب خلافت میں سب کے بعد قرار دیتا ہے من کان باکیا علی الحق فلیبک ومن کان باکیا علی الظلم فلیبک۔

اب جو شخص رونا چاہے وہ روئے اور جو قوم کے وفات پر سنت ماتم بچھانا چاہے تو رونے کا موقع سامنے ہے یہ ایک موقع تھا جہاں سے عقلی حیثیت سے تقیہ کا وجوب اور اسکا عبادت ہونا ثابت کیا اب اگر علمائے اہلسنت کے تصریحات اور قرآن مجید کے واقعات کو نقل کروں تو ارباب علم کے حس کیلئے اور اسکے وجوب کیلئے ارباب انصاف کے نزدیک کافی ہوگا مدیر سے مجھے اس بات کی کم امید ہے کہ وہ قرآنی استدلال کو تسلیم کرے کیونکہ وہ تقدم عدم تحریف کا مدعی ہے لیکن بایں ہمہ منزل میں قرآن کے موافق اسکی رفتار مشتبہ ہے جسید کلام میں کچھ اقوال علمائے حضرت اہلسنت گزری جنہوں نے کذب میں کی اجازت دی تھی بلکہ موافقت کے بجائے مخالفت صحیح سطر میں بھی تجویز کی تھی۔ اور اسے واجب بھی بتایا تھا فراجع۔ فی تہذیب الکمال فی معرفۃ الرجال الذی ہو مہذب الکمال فی معرفۃ الرجال

عبد الغنی المقدسی قال محمد بن موسی الحرسی حدثنا یاسر بن صبیحۃ قال حدثنا عطیۃ جی حاجب عن

یونس ابن عبید قال سئلت الحسن قلت یا ابا سعید انک تقول قال رسول اللہ وانک لم تدرکہ قال یا ابن اخی لقد سئلتنی عن شیء ما سئلنی عنہ احد قبلک ولولا منزلتک منی ما اخبرتک انی فی زمان کما تری وکان فی زمان الحجاج کل شیء سمعتنی اقولہ قال رسول اللہ فہو عن علی بن ابیطالب غیر انی فی زمان لا استطیع ان اذکر علیا۔ جناب علامہ سعی من الالقاب والاوصاف جناب مفتی محمد قلی صاحب دہلوی اعلی اللہ مقامہ نے اپنے رسالہ تقیہ میں فخر الدین دہلوی کی عبارت نقل فرمائی ہے جو اوپر مذکور ہو چکی اسمیں مذکور ہے کہ تہذیب کمال جو کتاب الکمال فی معرفۃ الرجال کا مہذب ہے جو عبد الغنی مقدسی کی تصنیف سے ہے یہ روایت مرقوم ہے جسے بسلسلہ مذکور یونس بن عبید سے نقل کیا ہے وہ کہتا ہے کہ میں نے حسن بصری سے پوچھا کہ اے ابو سعید تم کو میں حدیث بیان کرنے میں سنا کہ تم کہتے ہو کہ رسول اللہ نے کہا حالانکہ تم نے خود جناب رسالتمآب نہیں پایا پھر کیونکر حضرت کی طرف قول کو منسوب کرتے ہو حسن نے کہا اے میرے بھتیجے تو نے وہ بات مجھ سے پوچھی جو کسی نے آج تک مجھ سے نہیں پوچھی تھی اور اگر تمہاری قدر میرے نزدیک منزلت نہ ہوتی تو میں ہرگز تمہیں نہ بتاتا میں اس زمانہ میں ہوں جو تمہیں معلوم ہے کیسا زمانہ ہے اور یہ وقت حجاج ابن یوسف کے عمل کا تھا تم ہر حدیث جو میں رسول اللہ کی طرف منسوب کرتا ہوں اور تم اسے سنو تو تم اسے سمجھا کرو میں جناب علی ابن ابیطالب سے روایت کرتا ہوں مگر چونکہ میں اس زمانہ میں ہوں جس زمانہ میں میں علی کا نام نہیں لے سکتا اس لئے انہیں لیتا۔

اس نقل سے صاف روشن و آشکار ہے کہ حسن بصری نہ صرف تقیہ کا قائل تھا بلکہ وہ تقیہ کا عامل تھا اور اگر وہ اسے واجب نہ سمجھتا تو کبھی کبھی ترک بھی کرتا لیکن اس نے ترک نہیں کیا بلکہ اسکا علامت مقرر کر رکھا اس تقیہ استمراری کا ثبوت ہے۔ اس روایت میں ایک نکتہ مفیدہ مستور ہے میں چاہتا ہوں کہ ناظرین رسالہ مبارکہ سبیل اور خود مدیر النجم نے اگر اسکا تعصب نے محل سے ملتفت ہونے دی تو وہ اس اہم مطلب کی طرف التفات فرمائیں یہ حجاج کا زمانہ حکومت تھا جسمیں حسن بصری مبتلائے بلائے تقیہ تھے۔ اور یہ سلطنت عبد الملک کا دور تھا اور عبد الملک وہ شخص تھا جسکے متعلق سراج الملوک میں ابوبکر بن محمد بن الولید نے لکھا ہے قد روی عن

عبد الملک بن مروان انہ لما ولی الخلافۃ اخذ المصحف فوضعہ فی حجرہ ثم قال ہذا فراق

یعنی دہینک، بیٹے عبدالملک بن مروان سے اس امر کی روایت کی گئی ہے کہ جب عبدالملک کی نوبت خلافت پہونچی تو اسنے قرآن کو لیکر اپنی گود میں رکھا پھر قرآن سے مخاطب ہو کر کہا کہ اب میرے تیرے جدائی کا وقت آگیا۔ سراج الملوک صفحہ ۳۹ مطبوعہ مصر۔

ذرا خلافت کی عظمت دیکھو اسکا دنیا اسلامی افق میں اس حد تک پہونچ گیا تھا کہ خلفاء اسبات کا یقین رکھتے تھے کہ خلافت قرآن کی حکومت سے آزاد ہے اور خلیفہ کیلیے قرآن ضروری نہیں اور وہ اسکا محکوم ہو سکتا ہے یہ سلسلہ فہم عبدالملک تک وراثتاً یا روایتاً پہونچا ہوگا بہرحال وہ خلافت کے وقت قرآن کو وداع کرتا ہے اور ہر مسلمان ہے یہ ایک علامتی قول تھا جو بیٹے نقل کر دیا اگر میں اس مذاق کو لیکر بیٹھ جاؤں گا تو لوگوں کے چشم و ابرو پر بل پڑنے لگینگے اور بعث سخن میں فرق آجائیگا۔ بہرحال عبدالملک کی دہن اور حجاج کی وزیری نظم پر کر بیٹھنے کی ہی تھی اسکی خیر مبنی کا کیا کہنا حجاج اپنے ظلم و ستم میں عبدالملک کا آئینہ صورت نما تھا۔ یہیں انتہائی اسے ویسے کے لیے کافی ہے کہ امیر المومنین علی ابن ابیطالبؑ کا ذکر خیر بھی بہت نہیں ہی مجھے غیر منظور تھا جو خیر جان لیے انسان کو چھوڑ نہی تھا پھر اسکے ساتھ ہی ساتھ یہ بھی خیال میں رہے کہ جب قرآن چھوڑ دیا جائے تو قرآن کے ساتھی سے اتصال کیونکر گوارا کیا جائے واقعاً قرآن مجید عجب آیت روشن ہے جس نے کسی چیز بغیر ذکر چھوڑا نہیں چنانچہ مفارقت قرآن کا بھی تذکرہ موجود ہے اور کس انداز سے اسکے میں اپنے غیبی خبر کو اس نقل سے متصل کر کے نبوت و رسالتمآب پر قرآن کی روشنی ڈالنا چاہتا ہوں۔ پارہ ۱۹ رکوع اول سورۂ فرقان میں ہے۔ ویوم یعض الظالم علی یدیہ یقول یا لیتنی اتخذت مع الرسول سبیلا یا ویلتی لیتنی لم اتخذ فلانا خلیلا لقد اضلنی عن الذکر بعد اذ جاءنی وکان الشیطان للانسان خذولا وقال الرسول یا رب ان قومی اتخذوا ہذا القرآن مہجورا وکذلک جعلنا لکل نبی عدوا من المجرمین وکفی بربک ہادیا ونصیرا۔ یہ اس دن کا قصہ ہے جو کافروں پر سخت دن ہوگا اور ستمگر ظالم اپنے ہاتھوں کو یہ کہتا ہوا کاٹے گا کہ کاش میں پیغمبر والا راستہ اختیار کرتا ہائے افسوس کاش میں فلاں شخص کو اپنا دوست نہ قرار دیتا اسنے تو مجھے گمراہ کر دیا ذکر سے بعد اسکے کہ وہ میرے پاس آیا اور

لہ یہاں [illegible] ظالمین کے شکوہ کا اور دیگر تو تفصیل معلوم ہو [illegible]

شیطان تو ہمیں انسان کو رسوا کرنے والا ہے۔ اور رسول یہ کہیگا کہ اے میرے پروردگار میری قوم نے اس قرآن کو چھوڑ دیا اور یونہی ہمنے ہر پیغمبر کیلیے مجرموں میں سے دشمن قرار دیا ہے اور تیرا رب ہدایت اور مدد کرنے کیلیے کافی ہے) یہ قرآن کے چھوڑ دینے کی شکایت پیشگاہ باری میں پیش ہونا عبدالملک کے خلافت سے بہت پہلے قرآن میں نازل ہو چکا لیکن لوگ اسکو مجاز بلا حقیقت سمجھا کیے مگر اب امید ہے کہ اس نقل کے بعد یہ بالکل حقیقی بات بھی جائے۔

مختصر یہ ہے کہ اس قسم کے دور میں اگر علی کی دشمنی ایسی واجب بھی جائے جیسا کہ حسن بصری کے کلام میں اس کا پتا ملتا ہے تو کوئی تعجب کی بات نہیں ہے کیونکہ وہ دشمنی قرآن کا زمانہ تھا پھر جب نام لینے کی وجہ سے اور لوگوں سے دشمنی ہو جاتی ہو اور انکو تقیہ کرنا پڑتا ہو تو بتائیے کہ خاص وہ امیر المومنین پر کیسا بار وقت ہوگا اور انکو کس قدر تقیہ کی ضرورت ہوتی ہوگی لیکن میرا انجم تقیہ کے نام سے خفا ہوتا ہے اسکی وجہ صرف یہی ہو سکتی ہے کہ لفظ تقیہ داستان ہو رضاع کو دوہرا دیتا ہے اور وہ چاہتا ہے کہ یہ قصے دفن ہو جائیں مگر ہم اور ہمارے دشمن جب دونوں ان قصوں پر متفق ہوں تو یہ باتیں کیونکر مخفی ہو سکتی ہیں۔

امیر المومنین کی ایک بہترین فضیلت

روایتاً حسن بصری سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ بجائے امیر المومنین علی بن ابیطالب علیہ السلام نام نامی رسالتمآب صلی اللہ علیہ و آلہ لیا کرتا تھا اسلیے کہ تقیہ نے امیر المومنین کا نام لینے کی اجازت نہ دیا تھا غیر وہ نام نہ لیتا لیکن بجائے جناب رسالتمآب کے وہ کسی اور شخص کا نام لے سکتا تھا جسکی وہ پیغمبر پر افترا کرنے سے بچ جاتا اگر کوئی شخص حسن بصری کے اس فعل میں غور کرے تو اسے اس تبدیلی نام میں نہایت حسن و خوبی نظر آئیگی ہر چند اس حسن تعبیر میں حسن نظر آئیگا اتنا ہی فضیلت امیر المومنین سے حجاب اٹھتا جائیگا بات یہ تھی کہ حسن بصری کو قول امیر المومنین پر اتنا ہی وثوق تھا جسقدر پیغمبر کے زبان کی کہی ہوئی بات پر ہو سکتا تھا لہٰذا آپکے کسی بات کے سننے کو وہ ایسا ہی سمجھتا تھا جیسا کہ اسنے خود رسول اللہ سے سنا اور یوں وہ ایک کے نام کی جگہ دوسرے کا نام لے آتا تھا اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حسن بصری بھی آپکو معصوم اور منزل منزلۃ الرسول سمجھتا تھا جیسا کہ تمام فرقہ معتزلہ کا بھی خیال ہے جسکی

تصریح اپنی کتاب میں جابجا ابن ابی الحدید معتزلی نے کی ہے۔ بہرحال حسن بصری کو اہلسنت پیشوا سمجھتے ہیں اور غالباً مولوی عبدالشکور صاحب بھی اسے مذموم نہ سمجھتے ہوں گے وہ تقیہ کرتا تھا اور برسوں اس نے اس تقیہ میں اپنی زندگی بسر کی۔

امام غزالی کا فتویٰ

کتاب احیاء العلوم میں ہے ومن نجی ولیاً من اولیاء اللہ مستتراً وقد اختفی من ظالم حریص ان یقتلہ عن علمہ فالکذب فیہ واجب

یعنی اگر کوئی ظالم کسی خدا کے دوست کا اسلئے تعاقب کرے کہ وہ اسے قتل کر دے اور وہ خدا کا دوست کہیں محفوظ مقام میں چھپ رہے اور اسکا پتا کسی کو معلوم ہو تو اسے ہرگز اسکا پتہ نہ بتانا چاہیے بلکہ اس میں جھوٹ بولنا واجب ہے۔

افسوس ہے کہ صاحب احیاء نے بھی جھوٹ کو واجب کہہ دیا جو مولوی عبدالشکور صاحب کی چلے تو وہ ہرگز ایسا نہیں کر سکتے کیونکہ انکے دل کی منشا تو اسی میں ہے کہ تمام اولیاء اللہ قتل ہو جائیں بزم دنیا کے بارونق ہونے کیلئے صرف دشمنان خدا ہی کا وجود کافی ہے۔

امام زہری کا قول

توضیح حاشیہ توضیح میں ہے قال الامام الزہری ان الفعل المکرہ حرام کالقتل والزنا وفرض کشرب الخمر واکل المیتۃ ورخص لہ کاجراء کلمۃ الکفر والافطار واتلاف مال الغیر۔

وہ فرماتے ہیں کہ مجبوری کا کام کئی طرح کا ہوتا ہے کبھی تو حرام ہوتا ہے جیسے قتل اور زنا اور کبھی واجب ہوتا ہے جیسے شراب کا پینا اور مردار کا کھانا اور کبھی ایسا ہوتا ہے کہ اسے مجبوری کی وجہ سے رخصت دی جاتی ہے کہ وہ اس کام کو کرے جیسے کلمہ کفر کا زبان پر جاری کرنا روزہ افطار کرنا اور غیر کا مال تلف کر دینا۔

دیکھئے آپ جھوٹ ہی کو روتے تھے یہاں تو قتل وزنا بھی ہوا شراب خوری واجب اور کلمہ کفر کا جاری کرنا رخصت ہو گیا۔

امام فخر الدین رازی کی رائے

تفسیر کبیر امام فخر الدین رازی میں ہے التقیۃ جائزۃ لصون النفس وھل ھی جائزۃ لصون المال یحتمل ان یحکم فیھا

فرماتے ہیں کہ تقیہ تو جان بچانے کیلئے ضروری ہی جائز ہے رہا یہ امر کہ مال کے بچانے کیلئے بھی تقیہ جائز ہے یا نہیں تو اسکے

بالجواز لقولہ علیہ السلام حرمۃ مال المسلم کحرمۃ دمہ ولقولہ علیہ الصلوۃ والسلام من قتل دون مالہ فھو شہید ولان الحاجۃ الی المال شدیدۃ والماء اذا بیع بالغبن سقط فرض الوضوء وجاز الاقتصار علی التیمم دفعاً لذلک القدر من نقصان المال فکیف لا یجوز ھھنا۔

جائز ہونے کا بھی احتمال ہے کیونکہ جناب رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مال مسلم ویسا ہی محترم ہے جیسی اسکی جان محترم ہے اور اسلئے بھی کہ حدیث میں وارد ہوا کہ جو شخص اپنے مال کی حفاظت میں قتل کر دیا جائے وہ شہید ہے اور اسلئے بھی کہ مال کی جانب احتیاج نہایت شدید ہے اور پانی اگر زیادہ قیمت کو بکے یعنی گراں فروخت ہو اور مغبون کیا جائے تو وضو واجب ساقط ہو جاتا ہے اور صرف تیمم پر اکتفا جائز ہوگا اسلئے کہ نقصان مال سے بچیں تو کیا مال بچانے کے لئے تقیہ جائز نہ ہوگا۔

نیز اسی تفسیر کبیر میں ہے۔ روی عن الحسن انہ قال التقیۃ جائزۃ للمؤمنین الی یوم القیامۃ وھذا القول اولی لان دفع الضرر عن النفس واجب بقدر الامکان

یعنی حضرت حسن بصری سے روایت کی ہے وہ کہتے تھے کہ تقیہ مومنین کیلئے روز قیامت تک جائز ہے امام فخر الدین رازی کہتے ہیں کہ یہی قول اولیٰ ہے اس لئے کہ نفس سے ضرر کا بقدر امکان دفع کرنا واجب ہے۔

تنبیہ یہ بات ناظرین کو معلوم رہے کہ احکام تکلیفیہ مباح مکروہ مستحب واجب حرام ہیں اس تقسیم میں مباح مقابل واجب ہے اور کبھی واجب کے ساتھ جمع نہ ہوگا اور ایک وہ اباحت بمعنی جواز ہے جو مباح اور مستحب و واجب کے ساتھ جمع ہو جاتی ہے وہ ان احکام کا مقابل نہیں بلکہ وہ ان تینوں چاروں میں مشترک ہے چونکہ امام فخر الدین رازی نے پہلے قول میں بیان کیا ہے کہ تقیہ جان بچانے کیلئے جائز ہے اور نقل قول حسن بصری کے بعد انہوں نے وہ دلیل بیان کی ہے جو تقیہ کو واجب کرتی ہے اسلئے پہلے قول میں بھی انکے جائز سے واجب ہی مراد ہو سکتی ہے۔

ابن حجر کا معقولہ تقیہ کے بارے میں

فتح الباری میں فرمایا ہے۔ وقد اجمع الفقہاء علی وجوب طاعۃ السلطان المتغلب والجہاد معہ

یعنی فقہائے اسلام کا اس بات پر اجماع ہے کہ سلطان ظالم کی اطاعت واجب ہے بزور ہی سہی اسکے ساتھ جہاد کرنا واجب ہے اور اسکی اطاعت

معروان لا حتج من الخروج علیہ لما فی ذلک من حقن الدماء وتسکین الدہماء۔	اس پر خروج کرنے سے بہتر ہے کیونکہ اس میں عہد [illegible] جانوں کی حفاظت اور خونریزی کا انسداد ہے اور [illegible]

ان کلمات سے صاف روشن و آشکار ہے کہ تقیہ کا وجوب اجماعی ہے بلکہ ہم اگر انصاف پر چلیں تو ہم بلا تامل کہہ سکتے ہیں کہ یہ اجماع اس اجماع سے کہیں زیادہ قوی ہے جو حضرت ابوبکر کے خلیفہ ہونے پر بقول شیعہ منعقد ہوا تھا افسوس ہے کہ ہمارے مخاطب مولوی عبد الشکور صاحب کا انکار اس اجماع قوی کے مقابلہ میں ہے لیکن اس اجماع ضعیف پر ایمان قائم ہے۔

صحابہ و تابعین نے تقیہ کیا

تہذیب الکمال میں ہے۔ قال الاعمش عن عبد الملک بن میسرۃ عن النزال بن سبرۃ قال کنا مع حذیفۃ فقال لہ عثمان یا ابا عبد اللہ ما الذی بلغنی عنک قال ما قلتہ قال عثمان انت اصدقہم وابرہم فلما خرج قلت یا ابا عبد اللہ الم تقل ما قلتہ قال بلی ولکنی اشتری دینی ببعضہ مخافۃ ان یذہب کلہ انتہی۔	اعمش نے سلسلۂ مذکورہ سے روایت کی ہے کہ ہم حذیفہ کے ساتھ تھے عثمان نے حذیفہ سے کہا کہ اے ابو عبد اللہ یہ کیا خبریں تمہارے متعلق مجھے پہنچتی ہیں حذیفہ نے کہا کہ میں نے وہ باتیں نہیں کہیں عثمان نے کہا کہ تم ان سب سے زیادہ سچے اور زیادہ حقوق کا خیال کرنے والے ہو پھر جب عثمان وہاں سے چلے گئے تو میں نے حذیفہ سے کہا کیا تم نے وہ باتیں نہیں کہی تھیں حذیفہ نے کہا کہ کہی تھیں لیکن اپنے دین کے بعض حصے سے بعض کو خرید لیتا ہوں اس خوف سے کہ کہیں کل نہ جاتا رہے۔

ابن عباس نے تقیہ کیا

فی [illegible] شرح [illegible] میں ہے اول من حکم بالعول عمر لما وقع فی عہدہ صورۃ ضاق مخرجہا عن فروضہا فشاور الصحابۃ فیہا فاشار العباس الی العول فقال اعیلوا الفرائض فتابعوہ علی ذلک ولم ینکرہ	یعنی پہلا وہ شخص جس نے عول کا حکم دیا حضرت عمر تھے کیونکہ ان کے عہد میں ایک ایسا مسئلہ پیش ہوا تھا جس میں تمام سہام [illegible] نہ ہو سکتے تھے عمر نے صحابہ سے مشورہ کیا تو عباس نے عول (نقصان) کا اشارہ کیا کہ اس کے سہام پر حکم [illegible] تمام صاحبان میراث پر نقصان ڈالا جائے لوگوں نے اس حکم کی پیروی کی اور کسی نے

احد الا ابنہ بعد موتہ فجعل یدہ یظہر [illegible] فی زمن عمر قال ہبتہ وکان مہیبا الی ان قال یا مجتمعون حتی نجتمع فنجعل لعنۃ اللہ علی الکاذبین ان الذی احصی رمل عالج عدداً لم یجعل فی مال نصفین ونصفا وثلثا انتہی	بجز اس کے بیٹے کے اس سے انکار نہ کیا لیکن جب عمر نے انتقال کیا تو عباس کے بیٹے نے یعنی ابن عباس نے اس سے انکار کیا لوگوں نے کہا کہ عمر کے زمانہ میں کیوں نہ انکار کیا کہا مجھے ان سے خوف معلوم ہوا اور وہ ایک ہیبت آدمی تھے [illegible] کہ وہ خدا جس نے ریگ عالج کے ذروں کو شمار کیا ہے [illegible]

معلوم ہوا اس نے کسی مال میں دو نصف اور ایک ثلث نہیں ٹھہرایا صاف ہے کہ دو نصف سے یہ مال پورا ہو جائیگا اب یہ ثلث کہاں سے آئیگا۔

اور کتاب التحقیق شرح مختصر ابن الحاجب میں اسبات کے بیان میں کہ اجماع سکوت سے ثابت نہیں ہوتا مرقوم ہے۔

ورد وہ الظاہری وبعض المعتزلۃ [illegible] بان السکوت قد یکون عن ہیبۃ وتقیۃ کما قیل ان ابن عباس لما اظہر قولہ فی العول قیل لہ ہلا قلت ذلک فی زمن عمر فقال کان رجلا مہیبا فہبتہ وفی روایۃ منعنی من ذلک درتہ۔	یعنی داؤد ظاہری اور بعض معتزلہ نے اس مطلب کا رد کیا ہے کہ اجماع سکوت سے ثابت نہیں ہوتا اس بات سے تمسک کیا ہے کہ سکوت کبھی ہیبت اور تقیہ کے وجہ سے ہوتا ہے جیسا کہ منقول ہے ابن عباس نے عول کا انکار کیا تو ان سے لوگوں نے کہا کہ اس قول کو عمر کے وقت میں کیوں نہ ظاہر کیا کیونکہ عول کے قائل تھے ابن عباس نے کہا کہ میں انہیں ڈرتا اور وہ ایک ہیبت آدمی تھے اور بعض روایتوں میں ہے کہ انہوں نے کہا کہ مجھے اس قول کے ظاہر کرنے سے ان کے درہ نے روکا۔

ایک دوسرا قول

مختصر [illegible] میں ہے عن نافع ان رجلا سال ابن عمر عن متعۃ النساء فقال حرام فقال ان ابن عباس یفتی بہا	نافع سے منقول ہے کہ ایک شخص نے ابن عمر سے متعہ کے متعلق پوچھا انہوں نے جواب دیا کہ حرام ہے اس سائل نے کہا کہ ابن عباس تو اس کے جواز کا فتوی دیتے ہیں ابن عمر نے کہا کہ ابن عباس نے عمر کے زمانہ [illegible]

فقال ابن عمر لا ترجم مرجا ابن عباس فی زمن عمر لاخذ فیہا احد رجمہ انتہی ۔

یعنی ابن عمر نے کہا کہ اگر کوئی عمر کے زمانہ میں ایسا کرتا تو وہ اسے سنگسار کرتے۔ یہ ابن عمر کا قول ہے کہ اس زمانہ میں وہ سنگسار کرتے اور ابن عباس کے فتویٰ متعہ سے صاف ظاہر ہے کہ ہیبت اور تقیہ سے ابن عباس کو روکا۔

اور جب ابن عباس ایسے لوگ مخالفت سے خوف کرتے تھے تو اوروں کا حال بھی اس سے معلوم ہو سکتا ہے۔ یہیں سے امام فخر الدین رازی کے قول کی کمزوری معلوم ہوتی ہے جو انہوں نے تفسیر کبیر میں بحث متعہ میں کہا ہے کہ حضرت عمر نے متعہ کو حرام کہا اگر وہ جائز ہوتا اور پھر وہ حرام کرتے تو یا کفر عمر لازم آتا یا کفر صحابہ اس لئے کہ عمر نے متعہ حرام کرنے کی مخالفت نہیں کی۔ شق اول کے متعلق تو ہم کچھ نہیں کہہ سکتے لیکن شق دوم میں صحابہ کے سکوت کا عذر درہ کو دیکھتے ہوئے صاف واضح ہے کیونکہ جب ہیبت تھی اور درہ کا ڈر تھا تو کفر کیا ہے کو لازم آئیگا۔

ابن عمر نے تقیہ کیا

مشکوٰۃ میں ہے عن ابن عمر قال صلی رسول اللہ صلعم بمنیٰ رکعتین و ابوبکر بعدہ و عمر بعد ابی بکر و عثمٰن صدرا من خلافتہ ثم ان عثمٰن صلی بعد اربعا فکان ابن عمر اذا صلی مع الامام صلی اربعا و اذا صلاہا وحدہ صلی رکعتین متفق علیہ ۔

یعنی ابن عمر سے روایت کی گئی ہے وہ کہتے تھے کہ رسول نے منیٰ میں دو رکعتیں نماز کی پڑھیں پیغمبر کے بعد ابوبکر نے بھی ایسا ہی کیا اور ابوبکر کے بعد عمر نے بھی ایسا ہی کیا لیکن جب عثمان کا دور ہوا تو شروع خلافت میں انھوں نے بھی ویسا ہی کیا لیکن بعد میں انھوں نے دو رکعتیں دو سرا کر چار رکعتیں پڑھیں ابن عمر جب امام کے ساتھ پڑھتے تھے تو چار پڑھتے تھے اور جب منفرد ہو کر پڑھتے تھے تو دو پڑھتے تھے یہ وہ روایت ہے جس پر بخاری اور مسلم دونوں نے اتفاق کیا ہے۔

ابن مسعود نے تقیہ کیا

ازالۃ الخفا میں ہے صلی ابن مسعود بمنیٰ مع عثمٰن | یعنی ابن مسعود نے منیٰ میں عثمان کے ساتھ چار رکعتیں نماز پڑھی

اربعا فقیل لہ اتحدثنا ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صلی رکعتین و ابابکر و عمر فقال بلیٰ ولکن عثمٰن کان اماما فما اخالفہ والخلاف شر ۔

لوگوں نے ان سے کہا کہ تم ہم سے بیان کرتے ہو کہ پیغمبر نے دو رکعتیں پڑھیں اور ابوبکر و عمر نے دو رکعتیں پڑھیں اور پھر تم نے عثمان کے ساتھ چار رکعتیں پڑھیں ابن مسعود نے کہا کہ ہاں یہ سچ ہے مگر عثمان امام وقت خلیفہ تھے کیا میں ان کی مخالفت کروں حالانکہ مخالفت میں برائی ہے۔

اب آپ ہی ملاحظہ فرمائیں کہ عثمان بجائے قصر اتمام کرتے ہیں جو بالکل قول و فعل رسول کے خلاف ہے اور ابن مسعود مخالفت نہیں کر سکتے اسی کا نام تقیہ ہے جس طرح تقیہ ثابت ہے ویسی ہی جو جرأت خلفاء پر روشنی پڑتی ہے۔

راوی حدیث رسول نے تقیہ کیا

حدیث ان آل ابی فلاں لیسوا لی باولیاء کی شرح میں نووی نے لکھا ہے و ہو ہذہ الکنایۃ بقولہ یعنی فلانا من بعض الرواۃ خشی ان یسمیہ فیترتب علیہ مفسدۃ و فتنۃ اما فی حق نفسہ و اما فی حق غیرہ فکنی عنہ ۔

یعنی آل فلاں حدیث پیغمبر میں تھا بلکہ ان کی تصریح تھی راوی نے صراحت سے خوف کیا کہ نام لینے میں کوئی فتنہ اور فساد نہ برپا ہو جائے اور راوی کے حق میں ہو یا اس کے غیر کے حق میں، بہر حال خوف کے سبب فلاں کی کنایہ سے ذکر کیا ہے۔

ابراہیم نخعی نے تقیہ کیا

صحیح بخاری میں عبد اللہ بن عمر سے روایت ہے ۔ ابراہیم النخعی کان یتکلم عند وقت الخطبۃ فقیل لہ فی ذلک فقال انی صلیت الظہر فی داری ثم رحت الی المسجد تقیۃ

یعنی ابراہیم نخعی خطبہ کے وقت باتیں کیا کرتے تھے لوگوں نے ان پر اعتراض کیا کہا کہ میں ظہر گھر میں پڑھ چکا ہوں تقیہ کی وجہ سے میں مسجد میں آ جاتا ہوں!

زرارۃ ابن اوفی الحرشی نے تقیہ کیا

طبقات ابن سعد میں ہے قال اخبرنا عارم بن الفضل قال حدثنا حماد بن زید قال حدثنا ہشام بن حسان عن عائشۃ بنت عصمۃ ان زرارۃ بن اوفی کان یصلی فی منزلہ الظہر والعصر ثم یاتی الحجاج فیجمع یعنی عائشہ سے روایت ہے کہ زرارۃ بن اوفی اپنے گھر میں نماز ظہر و عصر پڑھ کر حجاج کے ساتھ جمعہ کی نماز پڑھنے آتے تھے۔ یہ وہ شخص تھا جس کے متعلق طبقات میں ہے۔ اخبرنا اسحٰق بن ابی اسرائیل قال حدثنا عتاب بن المثنی القشیری عن بہز بن حکیم ان زرارۃ بن اوفی

اسم الفجر فی عہد بنی عبس فقرا حتی اذا بلغ فاذا نقر فی الناقور فذلک یومئذ یوم عسیر
علی الکافرین غیر یسیر خر میتا قال ہذا مکث فیہم حلبیہ یعنی ایکدن صبح کی نماز مسجد بنی عبس میں
انہوں نے امامت کی قراءت کرتے کرتے اس آیۂ غضب پر جب پہونچے فاذا نقر فی الناقور
فذلک یومئذ یوم عسیر علی الکافرین غیر یسیر تو مر کے گر پڑے بتر بیان کرتا ہے کہ انکا نام
لاخیو اور ان میں میں ما بھی تھا۔

عبداللہ بن عمر کا تقیہ

صحیح بخاری میں عبداللہ بن عمر سے روایت ہے۔

قال دخلت علی حفصۃ ونسواتہا تنطف قلت قد کان من امر الناس ما ترین فلم یجعل لی من الامر شیٔ فقالت الحق فانہم ینتظرونک واخشی ان یکون فی احتباسک عنہم فرقۃ فلم تدعہ حتی ذہب فلما تفرق الناس خطب معاویۃ قال من کان یرید ان یتکلم فی ہذا الامر فلیطلع لنا قرنہ فنحن احق بہ منہ ومن ابیہ قال حبیب بن مسلمۃ فہلا اجبتہ۔ قال عبداللہ فحللت حبوتی وہممت ان اقول احق بہذا الامر منک من قاتلک واباک علی الاسلام فخشیت ان اقول کلمۃ تفرق بین الجمع وتسفک الدم ویحمل عنی غیر ذلک فذکرت ما اعد اللہ فی الجنان قال حبیب

ابن عمر کہتے ہیں کہ میں حفصہ کے پاس گیا اور انکا یہ حال تھا کہ انکے گیسوؤں سے پانی ٹپک رہا تھا میں نے کہا جو کچھ لوگوں کا حال ہے وہ تو نے دیکھ لیا خلافت میں سے کوئی حصہ میرا نہ قرار دیا گیا حفصہ نے جواب دیا کہ لوگوں کے پاس جاؤ وہ تمہارے انتظار میں ہیں اور مجھے اس بات کا خوف ہے کہ کہیں تمہارے بیٹھ رہنے سے کوئی افتراق اور پھوٹ نہ پیدا ہو حفصہ باہر جانے پر اصرار کرتی رہیں یہاں تک کہ عبداللہ بن عمر وہاں گئے جب لوگ متفرق ہوئے تو معاویہ نے خطبہ پڑھا اور کہا کہ جس شخص کا ارادہ کچھ بھی معاملہ خلافت میں بولنے کا ہو تو وہ ہمارے سامنے اپنا سر بلند کرے کیونکہ ہم اس سے بھی زیادہ مستحق ہیں اور اسکے باپ سے بھی زیادہ مستحق ہیں اس سے انکی مراد عبداللہ بن عمر اور خود عمر تھے حبیب بن مسلمہ نے کہا کہ تم نے معاویہ کو جواب کیوں نہ دیا عبداللہ نے کہا کہ میں نے تو اپنی جان سے ہاتھ دھو کر قصد کیا تھا کہ کہوں کہ تجھ سے زیادہ

حفظت و
معصیت

مستحق خلافت وہ تھا جس نے تجھ سے اور تیرے باپ سے اسلام پر جنگ کی اس سے انکی مراد علی ابن ابیطالب تھے عبداللہ کا بیان ہے کہ میں ڈر گیا کہ ایسا نہو اس کلمہ سے آپس میں پھوٹ پیدا ہو جائے اور خونریزی کا سبب ہو اور ایسا نہو کہ جو میری مراد ہے اسکے علاوہ لوگ مراد لے لیں تو میں نے ان چیزوں کا تذکرہ کیا جنکو خدا نے جنت میں مہیا کر رکھا ہے یعنی خیر اگر یہاں نہ سہی تو وہاں سہی حبیب نے کہا کہ تم بچ گئے اور محفوظ رہے۔

قسطلانی نے شرح صحیح بخاری میں بیان کیا ہے

لعل معاویۃ کان رایہ تقدیم الفاضل فی القوۃ والمعرفۃ والرای علی الفاضل فی السبق الی الاسلام والدین فلذا اطلق انہ احق ورای ابن عمر خلاف ذلک وانہ لا یبایع المفضول الا اذا خشی الفتنۃ

یعنی معاویہ نے جو اپنی ذات کو خلافت کا مستحق بتایا تو شاید اسکا خیال یہ تھا کہ وہ شخص مقدم ہونا چاہئے جو قوت اور معرفت اور رائے میں زیادہ ہو اسکو اس شخص پر جو اسلام و دین کے جانب سابق ہو فضیلت ہے جبھی تو اس نے اپنے کو احق بتایا اور ابن عمر کی رائے اسکے خلاف تھی اور وہ مفضول کی بیعت اسی وقت کر سکتے تھے جب فتنہ کا خوف ہو ورنہ نہیں۔ اسکا مطلب یہی ہوا کہ تقیہ کی وجہ سے وہ بیعت کر سکتے تھے۔

حسن بصری نے تقیہ کیا

طبقات ابن سعد میں ہے قیل لابن الاشعث ان سرک ان یقتلوا حولک کما قتلوا حول جمل عائشۃ فاخرج الحسن فارسل الیہ فاکرہہ۔

لوگوں نے ابن اشعث سے کہا کہ اگر تو اس بات پر خوش ہو کہ تیرے گرد بھی لوگ ویسا ہی قتل ہوں جیسا کہ عائشہ کے اونٹ کے گرد قتل ہوئے تو حسن بصری کو نکالو ابن اشعث نے کسی کو انکے پاس بھیجا اور مجبور کیا

احیاء العلوم غزالی میں ہے یروی عن ابن عائشۃ ان الحجاج دعی فقہاء البصرۃ وفقہاء الکوفۃ قال فدخلنا علیہ ودخل الحسن البصری

یعنی ابن عائشہ سے روایت ہے کہ حجاج نے فقہائے بصرہ و کوفہ کو بلایا ہم سب اسکے پاس پہنچے اور آخر میں حسن بصری بھی پہنچے حجاج نے انکو دیکھ کر مرحبا کہا اور ایک کرسی منگوائی جو حجاج کے

من اخرج من دخل فقال الحجاج مرحبا بابی سعید الی الی ثم دعا بکرسی فوضع الی جنب سریرہ فقعد علیہ فجعل الحجاج یذاکرہ ویسئلہ اذ ذکر علی بن ابی طالب فنال منہ ونلنا منہ مقاربۃ لہ وفرقا من شرہ۔

تخت کے پہلو میں بچھا دی گئی اس پر حسن بصری کو بٹھایا گیا پھر حجاج نے ان سے باتیں کرنا شروع کیں اور ان سے سوال کرنا شروع کیا کہ اتنے میں امیر المؤمنین علی بن ابی طالب کا کچھ ذکر آ گیا حجاج ملعون نے آپ کی مذمت کرنا شروع کی اور ہم نے بھی اس کی خوشنودی کے لئے اور اس کے شر سے بچنے کے لیے ہاں میں ہاں ملائی۔

محمد بن سیرین و شعبی نے تقیہ کیا

وفیات الاعیان میں ابن خلکان نے بیان کیا ہے۔ لما ولی عمر بن ہبیرۃ الفزاری العراقین واضیفت الیہ خراسان ایام یزید بن عبد الملک استدعی الحسن بن ابی الحسن البصری وعامر بن شرحبیل الشعبی ومحمد بن سیرین وذلک فی سنۃ ثلث ومائۃ فقال لہم ان یزید بن عبد الملک خلیفۃ اللہ استخلفہ علی عبادہ واخذ علیہم المیثاق بطاعتہ واخذ عہدنا بالسمع والطاعۃ وقد ولانی ما ترون فکتب الی بالامر من امرہ فاقلدہ ما تقلدہ من ذلک الامر فما ترون فقال ابن سیرین والشعبی قولا فیہ تقیۃ

یعنی جس وقت عمر بن ہبیرہ والی عراقین بصرہ و کوفہ ہوا اور اس کے ساتھ خراسان بھی ملحق ہوا اور یہ اس وقت جب یزید بن عبد الملک خلیفہ مقرر ہوا تھا تو اس نے حسن بصری اور عامر بن شرحبیل شعبی اور محمد بن سیرین کو بلایا اور یہ واقعہ ۱۰۳ھ کا ہے اور ان لوگوں سے کہا کہ یزید بن عبد الملک خلیفہ ہے جس کو خدا نے اپنے بندوں پر خلیفہ بنایا ہے اور ان سے اس کی اطاعت کا عہد و پیمان لیا ہے اور ہم سے بھی عہد لیا ہے کہ ہم اس کا حکم سنیں اور اس کی اطاعت کریں اس نے مجھے اس ملک کا والی مقرر کیا ہے اور اب مجھے بھی بعض امور میں لکھتا ہے سپرد کیا ہے اگر تو ابن سیرین و شعبی نے دو باتوں کا جواب تقیہ میں دیا۔

ایک بڑے گروہ نے تقیہ کیا

فتح الباری میں ہے۔ اول من زخرف المساجد الولید بن عبد الملک بن مروان وذلک فی اواخر عہد الصحابۃ وسکت کثیر من اہل العلم عن انکار ذلک

یعنی پہلا وہ شخص جس نے مسجدوں کو منقش کیا وہ ولید بن عبد الملک بن مروان تھا اور یہ واقعہ آخر عہد صحابہ میں ہوا اور بہت سے اہل علم نے اس کے انکار سے

خوفا من الفتنۃ۔

سکوت کیا کیونکہ ان کو فتنہ کا خوف تھا۔

ابوذر کو تقیہ کا حکم

مشکوٰۃ میں ہے۔ عن ابی ذر رضی اللہ عنہ قال قال لی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کیف انت اذا کانت علیک امراء یمیتون الصلوٰۃ او یؤخرونہا عن وقتہا قلت فما تامرنی قال صل الصلوٰۃ لوقتہا فان ادرکتہا معہم فصل فانہا لک نافلۃ رواہ مسلم۔

ابوذر رضی اللہ عنہ سے منقول ہے انہوں نے کہا کہ مجھ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کیونکر اے ابوذر تمہارا کیا حال ہوگا جب تم پر ایسے امیر ہوں گے جو نماز کو مار ڈالیں گے یا اس کو اس کے وقت سے موخر کر دیں گے ابوذر کہتے ہیں کہ میں نے حضرت اقدس میں عرض کیا کہ پھر آپ کیا حکم دیتے ہیں فرمایا کہ تم نماز اپنے وقت پر پڑھ لیا کرو اگر تم ان کے ساتھ نماز پاؤ تو پھر ان کے ساتھ پڑھ لینا کیونکہ وہ تمہارے لیے نافلہ ہوگی اس کی روایت مسلم نے بھی کی ہے۔

شیخ عبد الحق دہلوی نے اس عبارت کا ترجمہ یوں کیا ہے۔ گفت ابوذر گفت مرا پیغمبر خدا چگونہ خواہد بود حال تو و چہ خواہی کرد وقتیکہ مسلط خواہند گشت بر تو بادشاہان کہ در خلافت ایشان اثارہ فتنہ است می میرانند نماز را و رعایت نمیکنند شرائط و آداب آن را یا پس می اندازند نماز را از اول وقتش یعنی از اوقات مختارہ۔ ابوذر میگوید گفتم کہ چہ میفرمائی مرا در آن وقت گفت آنحضرت بگزار نماز را در وقتش پس اگر دریابی نماز را با ایشان پس بگزار با ایشان نیز گزاردن نماز کہ ہمراہ ایشان بگزاری نفل خواہد بود برائے تو و ازینجا معلوم میشود کہ اگر امام تاخیر کند از وقت نماز خصوصاً کہ بوقت مکروہ اندازد اما صوم باید کہ بگزارد نماز خود را در اول وقت پیشتر از آن کہ امام فضیلت وقت و جماعت ہر دو دریابد و این در غیر نماز فجر و عصر و مغرب خواہد بود از جہت کراہت تنفل در آن وقت و عدم مشروعیت تنفل سہ رکعت یا اینکہ ارتکاب این کردہ خواہد بود از اثارہ فتنہ و اختلاف کلمہ کہ لازم آید از مخالفت امراء جابرہ انتہی میں شاہ عبد الحق صاحب کے عبارت کا بھی ترجمہ کرتا ہوں تاکہ ناظرین عام طور سے اس کی مراد کو بھی سمجھ لیں۔ ابوذر کہتے ہیں کہ مجھ سے پیغمبر نے فرمایا کہ تمہارا کیا حال ہوگا اور تم کیا کرو گے جب تم پر ایسے بادشاہ مسلط ہوں گے جن کی خلافت میں فتنہ و فساد کے برانگیختہ ہونے کا

خوف ہے وہ نماز کو مار ڈالیں گے اور اسکے شرائط اور آداب کی رعایت نہ کریں گے، نماز کو اسکی موت تک
بعد میں ڈال دیں گے یعنی ان وقتوں کے بعد پڑھیں گے جو ان نمازوں کے لیے اختیار کیے گئے ہیں
الحاصل ابوذر نے عرض کی کہ آپ مجھے کیا حکم دیتے ہیں ایسے وقت میں کیا کروں آپ نے فرمایا
کہ تم نماز کو اسکے وقت میں پڑھ لینا پس اگر نماز ان لوگوں کے ساتھ بھی مل جائے تو پڑھ لینا کیونکہ جو
نماز تم ان لوگوں کے ساتھ پڑھو گے نافلہ ہوگی تمہارے لیے۔ اس جگہ سے یہ بات معلوم ہوئی کہ اگر
امام وقت نماز سے تاخیر کرے خصوصاً جبکہ اسے وہ وقت مکروہ میں ڈالدے ماموم کو چاہیے کہ
وہ نماز کو اول وقت ادا کرے پھر امام کے ساتھ پڑھے تاکہ وقت کی فضیلت اور جماعت کی
فضیلت دونوں حاصل ہو جائیں اور یہ نافلہ ہو جانا غیر نماز فجر و عصر و مغرب میں ہوگا کیونکہ
ان اوقات میں نفل مکروہ ہے اور اس سبب سے بھی کہ تین رکعت کا نافلہ مشروع نہیں ہے جبکہ
مغرب کا شمار نافلہ میں ہوگا یا یہ کہ ان مکروہات کا ارتکاب فتنے کے برانگیختہ کرنے اور باہم پھوٹ
واقع ہو جانے سے سہل ہے جو مخالفت امرا جابرہ سے لازم آئیگی۔

اگر مترجم نافلہ کے لغوی معنے لیتا اور اصطلاحی نہ لیتا یا نافلہ سے مراد ثواب نافلہ مراد لیتا
تو یہ تکلفات جو اسے کرنے پڑے وہ نہ درپیش ہوتے۔ بہرحال تقیہ کی ہدایت تو ثابت ہوئی
اب چند باتیں اور غور کرنا چاہیے ایک تو یہ کہ خطاب رسول ابوذر سے ہے اور ابوذر رسالتمآب
کے بعد تین ہی بزرگواروں کے ماتحت رہے ایسلیے دو حکومتیں حضرت ابوبکر اور حضرت عمر کی
تھیں اور تیسری حکومت میں انکے جور و ظلم سے ابوذر نے مقام ربذہ میں انتقال کیا ہے یہ بات
نظر انداز کرنیکے قابل نہیں ہے کہ یہ دستور العمل جو پیغمبر نے جناب ابوذر کے لیے بتایا ہے اور
اُن کیلیے لازم العمل بھی تھا وہ کن امرا کے باعث تھا سوائے خلفائے ثلثہ اور کوئی اُن پر مسلط
نہیں ہوا تو اب معترض ہوا کہ وہ ہی خلفائے جابر ہوں اور وہی سلاطین جور ہوں اور انہیں کی
یہ صفت ہو کہ نماز کو وہ مار ڈالیں گے یا اسکے وقت سے اسکو موخر کر دینگے اور بعد انہی تعیین کے
اور دستور العمل کے معین ہو جانیکے یہی حدیث اس بات کا فیصلہ کر دیتی ہے کہ وہ لوگ جو

جو ابوذر پر مسلط تھے وہ کیسے تھے۔

دوسری بات یہ بھی قابل لحاظ اور نہایت ہی معنی خیز ہے کہ پیغمبر نے فرمایا۔ کیف انت اذا کانت
علیک امراء تمہارا کیا حال ہوگا جب تمہارے اوپر ایسے امرا مسلط ہوں الخ لفظ امرا فرمایا جس کا
ترجمہ عبدالحق صاحب نے بادشاہان فرمایا ہے لفظ خلفا نہیں فرمایا اور مذاق قوم کے بنا پر پیغمبر کو
خلفا کہنا چاہیے تھا لیکن اگر خلفا فرماتے تو یہ صفات جن کے مذموم ہونے میں کسی عاقل کے
نزدیک شبہ نہیں انکے واسطے نہ ثابت کیے جاتیں۔ لہذا یہ بھی ثابت ہوا کہ ابوذر پر مسلط ہونے والے
خلفا تھے بلکہ امرا تھے اس سے زیادہ ہمارے اور اہلسنت کے نزاع میں فیصلہ کرنے والی کون چیز
ہو سکتی ہے مجھے اُن لوگوں سے سخت تعجب ہوتا ہے جو احادیث کے ترجمے کرتے ہیں اور ان سے
احکام کو مستنبط کرتے ہیں اور مفاد حدیث پر ذرہ برابر غور نہیں کرتے اسی کا نام ہے طبع اسی کا نام
یہی معنی ختم اللہ علی قلوبہم الخ۔

پھر ابوذر کیلیے تقیہ کی ہدایت

عن ابی ذر قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم
قال و کیف تصنع اذا اخرجت منہ
المسجد النبوی قال آتی الشام قال کیف
تصنع اذا اخرجت منہا قال اعود الیہ
ای الی المسجد قال کیف تصنع اذا
اخرجت منہ قال اضرب بسیفی قال
صلی اللہ علیہ وسلم الا ادلک علی ما ہو
خیر لک من ذلک واقرب رشدا تسمع
وتطیع وتنساق لہم حیث ساقوک۔

حضرت ابوذر سے منقول ہے کہ جناب رسالتمآب نے ان سے فرمایا
کہ ابوذر کیا کروگے جب تم مسجد نبوی سے نکالے جاؤگے ابوذر نے کہا
کہ میں شام چلا جاؤنگا فرمایا کیا کروگے جب شام سے بھی نکالے
جاؤگے کہا میں پھر مسجد ہی میں چلا آؤنگا فرمایا کیا کروگے جب
پھر مسجد سے نکالے جاؤگے کہا میں اپنی تلوار سے اسوقت حملہ
کرونگا جناب رسالتمآب نے فرمایا کہ میں تمہیں اس سے بہتر
بات بتاؤں جو تمہارے لیے بہتر ہو اور وہ یہ ہے کہ ہر حکم کو
سنو اور اسکی اطاعت کرو اور جدھر تمکو وہ لوگ کھینچیں اسی
جانب کو کھنچ جاؤ۔ (فتح الباری شرح صحیح بخاری)

صاف ظاہر ہے کہ مفسدہ کے خوف سے تقیہ کا حکم دے رہے ہیں اور الفاظ رسول ابوذر کی

مظلومیت کا پتا دے رہے ہیں۔

انبیاء نے تقیہ کیا

صحیح مسلم میں ہے ابو ہریرہ سے روایت ہے اس نے کہا کہ پیغمبر نے فرمایا کہ

لم یکذب ابراہیم النبی الا ثلث کذبات ثنتین فی ذات اللہ قولہ انی سقیم وقولہ بل فعلہ کبیرہم ہذا وواحدۃ فی شان سارۃ فانہ قدم ارض جبار ومعہ سارۃ وکانت احسن الناس فقال لہا ان ہذا الجبار ان یعلم انک امراتی یغلبنی علیک فان سألک فاخبریہ انک اختی فی الاسلام فانی لا اعلم فی الارض مسلما غیری وغیرک۔ انتہی۔

یعنی معاذ اللہ ابراہیم پیغمبر نے کبھی جھوٹ نہیں کہا مگر صرف تین بار۔ دو جھوٹ خدا کی ذات کیلئے بولے اور وہ ایک تو انی سقیم تھا اور دوسرا فرمایا کہ بل فعلہ کبیرہم اور تیسرا سارہ کے باب میں کیونکہ جناب ابراہیم ایک بادشاہ جبار کے ملک میں تشریف لے گئے تھے اور انکے ساتھ جناب سارہ بھی تھیں اور حضرت سارہ جمیل ترین تھیں تو آپنے سارہ سے فرمایا کہ یہ ظالم بادشاہ اگر یہ سمجھیگا کہ تم میری بیبی ہو تو وہ تم پر قبضہ کریگا اور مجھ پر غالب ہو جائیگا تو اگر وہ تم سے پوچھے کہ تم انکی کون ہو تو کہہ دینا کہ میں انکی اسلامی بہن ہوں کیونکہ مجھے معلوم نہیں کہ تمام روئے زمین عالم میں میرے اور تمہارے کوئی اور مسلم ہے۔

اور شارح شفا نے (جیسا کہ سلطان المتکلمین جناب مفتی محمد قلی علیہ الرحمۃ والرضوان نے تحریر فرمایا ہے) جناب سارہ کو بہن کہنے کی وجہ یہ بیان کی ہے۔ قال تقیۃ خشیۃ ان یقتلہ یعنی جناب ابراہیم نے یہ قول تقیہ کی سبب سے کہا اس بات کو ڈر کے کہ کہیں وہ جبار حضرت کو قتل نہ کر ڈالے۔

اور نووی شارح مسلم نے وجہ دوم تاویل خبر میں یہ عبارت لکھی ہے۔

والوجہ الثانی وان کان کذبا لا توریۃ فیہا لکان جائزا فی دفع الظالمین وقد اتفق الفقہاء علی انہ لو جاء ظالم یطلب انسانا مختفیا لیقتلہ او یطلب ودیعۃ

یعنی وجہ دوم یہ ہے کہ اگر توریہ نہ بھی ہو اور کذب محض بھی ہو تو ظالموں کے دفع کرنے کیلئے جائز ہوگا اور تمام فقہاء اس بات پر متفق ہیں کہ اگر کوئی ظالم کسی آدمی کے قتل کرنے کیلئے جو چھپا ہوا ہو یا کسی انسان کی امانت ڈھونڈھتا ہو تاکہ غصب کرکے

لانسان لیاخذہا غصبا وسأل عن ذلک وجب علی من علم ذلک اخفاؤہ وانکار العلم بہ وہذا کذب جائز بل واجب لکونہ فی دفع الظلم عنہ فنبہ النبی علی ان ہذہ الکذبات لیست داخلۃ فی مطلق الکذب المذموم۔

اسے لے لے اور اسکا پتا لگائے اور لوگوں سے پوچھے تو اس شخص پر جس کو ایسے آدمی یا ایسی امانت کا علم ہو واجب ہے کہ اسے چھپائے اور کہہ دے کہ مجھے معلوم نہیں اور ایسا جھوٹ جائز ہے بلکہ واجب ہے کیونکہ ظلم کے دفع کرنے کیلئے ہے تو پیغمبر نے بیان کرکے آگاہ کر دیا کہ ایسے جھوٹ جنکا سبب دفع ظلم ہو وہ اس جھوٹ میں داخل نہیں جو مذموم ہے۔

جناب خلیل اللہ کا دوسرا تقیہ

امام فخر الدین رازی نے تفسیر کبیر میں اس آیت مبارکہ " فلما جن علیہ اللیل رای کوکبا قال ہذا ربی " (جب ابراہیم پر شب تاریک ہوئی اور انھوں نے ستارہ کو دیکھا تو کہا کہ میرا رب ہے) کی تفسیر میں لکھا ہے۔

الوجہ السادس انہ صلی اللہ علیہ وسلم اراد ان یبطل قولہم بربوبیۃ الکواکب الا انہ علیہ السلام کان قد عرف من تقلیدہم لاسلافہم وبعد طباعہم عن قبول الدلائل انہ لو صرح بالدعوۃ الی اللہ لم یقبلوہ ولم یلتفتوا الیہ فمال الی طریق بہ یستدرجہم الی استماع الحجۃ وذلک بان ذکر کلاما یوہم کونہ مساعدا لہم علی مذہبہم بربوبیۃ الکواکب مع ان قلبہ کان مطمئنا بالایمان ومقصودہ من ذلک انہ یتمکن من ذکر الدلیل علی ابطالہ وافسادہ وان یقبلوا قولہ وتمام التقریر انہ لما لم

حاصل یہ ہے کہ جناب ابراہیم صلوات اللہ علیہ نے ارادہ کیا کہ کواکب کے ربوبیت کو باطل فرمائیں اور یہی انکی قوم کے اعتقاد میں تھا مگر چونکہ آنحضرت نے یہ دیکھ لیا تھا کہ وہ اپنے آباؤ اجداد کے تقلید میں ہیں اور انکی طبیعتیں دلائل کے قبول کرنے سے بہت دور ہیں تو آپنے یہ خیال فرمایا کہ اگر میں انکو خدا کی طرف دعوت دونگا اور اسکو صاف صاف بیان کر دونگا تو ہرگز اسکو قبول نہ کریں گے اور کسی قسم کا التفات نہ کرینگے اس لئے آپنے ایسے کلام کے ذکر کی طرف میل فرمایا جو انکو دلیل کے سننے کی طرف متوجہ کرے اور یہ اس طریقے سے کہ آپنے ایک ایسا کلام ذکر فرمایا جو اس بات کا خیال دلاتا تھا کہ آپ قوم کے خیالات کی تائید فرماتے ہیں اور معاذ اللہ ربوبیت کواکب کے معتقد ہیں حالانکہ

يجد الى الدعوة طريقا سوى هذا
الطريق وكان عليه السلام مامورا
بالدعوة الى الله تعالى كان بمنزلة المكره
عليه كلمة الكفر ومعلوم ان عند الاكراه
يجوز اجراء كلمة الكفر على اللسان
قال الله تعالى الا من اكره وقلبه
مطمئن بالايمان واذا جاز ذكر كلمة
الكفر لصيانة بقاء شخص واحد فان
يجوز اظهار كلمة الكفر لتخليص عالم
من العقلاء من الكفر والعقاب
المؤبد كان اولى وايضا المكره على
ترك الصلوة لو صلى حتى قتل استحق
الاجر العظيم ثم اذا جاء وقت القتال
مع الكفار وعلم انه لو اشتغل بالصلوة انهزم
عسكر الاسلام فههنا يجب عليه ترك
الصلوة والاشتغال بالقتال حتى
لو صلى وترك القتال اثم ولو ترك
الصلوة وقاتل استحق الثواب بل
نقول من كان في الصلوة فرأى
طفلا او اعمى اشرف على غرق او حرق
وجب عليه قطع الصلوة لانقاذ ذلك

آپ کا قلب ایمان کے ساتھ مطمئن تھا اور آپ کا مقصود دینے کا صرف
صرف یہ بات تھی کہ آپ دلیل ابطال ربوبیت کواکب کو ذکر فرما سکیں
اور وہ اسکو قبول کر سکیں۔ علاوہ تقریر تمام سبب کے چونکہ جناب خلیل الرحمن
کے لیے کوئی اور راستہ دعوت حق کا سوائے اس راستہ کے نہ تھا اور آپ
خدا کی طرف سے دعوت حق پر مامور تھے تو چونکہ اسی طریقہ میں نصیحت
تو گویا آپ کلمہ کفر کے کہنے پر مجبور تھے اور یہ بات معلوم ہے کہ مجبور ہونے کے
وقت کلمہ کفر کا زبان پر جاری کرنا جائز ہے خداوند عالم نے خود
استثنا فرما دی ہے الا من اکرہ وقلبہ مطمئن بالایمان یعنی صرف
اس شخص کے لیے اجازت ہے جو مجبور کر دیا گیا ہو اور اسکا دل
ایمان کے ساتھ مطمئن ہو اور جب ایک شخص کے باقی رہنے کیلیے
کلمہ کفر کا جاری ہونا جائز ہو تو اگر عاقلوں کے ایک عالم کی نجات
کیلیے کفر وعذاب سے ایسا کلمہ کہا جائے تو بدرجہ اولی جائز
ہوگا اور یہی وہ شخص جو ترک صلوۃ پر مجبور کیا جائے اگر نماز پڑھے
اور اس میں قتل ہو جائے تو اسکے لیے اجر عظیم حاصل ہوگا اور
جب کفار سے جنگ کرنے کا وقت آئے اور اسکو یہ معلوم ہو کہ
اگر میں نماز میں مشغول رہونگا تو اسلام کا لشکر شکست کھا جائیگا
تو اس جگہ اس پر ترک نماز واجب ہوگی اور جہاد دشمن میں ہی
مشغولیت واجب ہوگی اور یہ وجوب اس حد پر ہے کہ اگر
نماز میں مشغول ہو جائے اور ترک قتال کرے تو گنہگار ہوگا
اور ترک نماز کرے اور جہاد دشمن میں مشغول ہو جائے تو مستحق
اجر ہوگا بلکہ ہم یہ کہتے ہیں کہ جہاد اور احترام لشکر اسلام کا خوف

الطفل وذلك الاعمى من ذلك
فكذا ههنا ان ابراهيم عليه السلام
تكلم بهذه الكلمة ليظهر من نفسه انه موافق
القوم حتى اذا اورد عليهم الدليل
المبطل لقولهم كان قبولهم
لذلك الدليل اتم وانتفاعهم باستماعه
اكمل ومما يقوي هذا الوجه انه
تع حكى عنه مثل هذا الطريق في
موضع آخر وهو قوله تع فنظر نظرة
في النجوم فقال اني سقيم فتولوا
عنه مدبرين وذلك لانهم كانوا
يستدلون بعلم النجوم على حصول
الحوادث المستقبلة فوافقهم على
هذا الطريق في الظاهر مع انه
كان بريئا في الباطن ومقصوده
ان يتوسل بهذا الطريق الى
كسر الاصنام فاذا جازت الموافقة
في الظاهر ههنا مع انه كان بريئا
في الباطن فلم لا يجوز ان
يكون في مسئلتنا كذلك۔

تو اور چیز ہے اگر نماز میں ہو اور کسی لڑکے یا اندھے کو دیکھے کہ وہ
پانی میں غرق ہوا جاتا ہو یا آگ میں جلا جاتا ہے تو ایسے وقت
پڑھنے والے پر اس بچہ اور اندھے کی نجات کے لیے نماز کا قطع کر دینا
واجب ہو جائیگا یہی مقام بحث میں خیال کرو کہ جناب ابراہیم
نے اس کلمہ کے ساتھ تکلم فرمایا کہ قوم پر یہ ظاہر ہو کہ آپ قوم کی موافقت
کرتے ہیں (ایسی صورت میں قوم کے دلمیں کینہ اور غضب ہوا نہ
استماع قول ہوتا ہی نہ ہوگا) تو ایسے وقت میں جب دلیل ابطال
قول قوم پر وارد کی جائیگی تو دلیل زیادہ کارگر ہوگی اور فائدہ بخش
دلیل کامل تر ہوگا۔ اور ان چیزوں میں سے جو اس وجہ مذکورہ کو
قوی کرتے ہیں یہ ہے کہ خداوند عالم نے دوسرے مقام پر بھی اسی طرح کا
استدلال جناب ابراہیم علیہ السلام کی زبانی نقل فرمایا ہے اور وہ
وہاں جہاں ارشاد ہوا ہے کہ فنظر نظرۃ فی النجوم فقال انی سقیم
یعنی ابراہیم علیہ السلام نے ستاروں کو دیکھ کر کہا کہ میں بیمار ہوں
فتولوا عنہ مدبرین جب انہوں نے یہ کہا تو قوم والوں نے انکی طرف سے
پیٹھ پھیر لیا اور چلے ہو گئے اور یہ اس وجہ سے کہ وہ لوگ حوادث
کے وقوع پر علم نجوم سے استدلال کیا کرتے تھے جب جناب ابراہیم
نے انہیں کے مذاق پر تکلم فرمایا کہ انکو انکے قول کا یقین آ گیا اور چونکہ
یہ موافقت جناب ابراہیم ظاہری تھی باطن میں وہ ہرگز نجوم کو
موثر نہیں سمجھتے تھے انکا مقصود یہ تھا کہ وہ لوگ انکو تنہا چھوڑ کر
چلے جائیں تو بتوں کے توڑنے کا راستہ نکلے تو جب اس مقام پر
قوم کی موافقت جائز ہوئی تو ہمارے مسئلہ مبحوث عنہا میں قوم کی

موافقت کیوں نہ جائز ہوگی۔

یہ تمام تقریر فخر الدین رازی کی تقیہ کی تجویز بلکہ وجوب پر دال ہے اور انبیا کے لیے وجوب تقیہ ثابت کرتی ہے وہ بھی کلمہ کفر کے استعمال کے ساتھ۔ تو ہم گروہ شیعہ نہ مرتبہ میں ان سے زائد ہیں نہ کمال نفسانی میں نہ مراتب تقرب الٰہی میں بلکہ لاکھوں درجہ ان سے کم ہیں جب ان کیلیے یہ عیب نہ ہوا اور نہ انکا دامن عصمت بے داغ تھا تو ہم ایسے امتی لوگوں کیلیے کیا عیب ہوگا بلکہ اس تقیہ کی وجہ سے ہم تابع سنن مرسلین ہوں گے۔ اب جہاں قرآن ہو انبیا کی تعریف ہو وہاں سعدی کا شعر ورد مع اسے بیاد گمراہ زینا دکھا کر سکتا ہے حالانکہ میں سعدی کی طرف سے قسم کھانے کو تیار ہوں کہ اس نے یہ مقام تقیہ میں ہرگز نہیں کہا ہے

نہ ہر جائے مرکب توان تاختن　　کہ جاہا سپر باید انداختن

﴿التماس سورۃ الفاتحہ﴾

سیدہ فاطمہ رضوی بنت سید حسن رضوی

سید ابوزر شہرت بلگرامی ابن سید رضوی

سید مظاہر حسین نقوی ابن سید محمد نقوی

سید محمد نقوی ابن سید ظہیر الحسن نقوی

سید الطاف حسین ابن سید محمد علی نقوی

سیدہ امّ حبیبہ بیگم

حاجی شیخ علیم الدین

شمشاد علی شیخ

مسیح الدین خان

فاطمہ خاتون

شمس الدین خان

یا صاحب الزمانؑ ادرکنی

خدمتگارانِ مکتبِ اھلبیت (ع)

سید حسن علی نقوی

حسّان ضیاء خان

سعد شمیم

حافظ محمد علی جعفری

Hassan
naqviz@live.com